۳

مکاتیبِ آزاد

مُرتّبہ

ساحل احمد

اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد

کتاب : مکاتیب آزاد

مرتب : ساحل احمد

اشاعت : اوّل۔ لاہور جنوری ۱۹۰۷ء
دوم۔ لاہور مارچ ۱۹۰۷ء
سوم۔ الہ آباد دسمبر ۱۹۹۷ء

تعداد : ۵۰۰

کتابت : ذکی احسن

طباعت : تاج آفسٹ۔ الہ آباد

ناشر : اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد

قیمت : ۳۵/ Rs. 35/=

رابطہ:- لٹریری بک سنٹر ۱۲۶ چک الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

پیش لفظ

(۱)

آزاد کے یہ ۲۸ خط سید حسن بلگرامی کے نام نامی سے موسوم ہیں۔ جو مخزن میں شائع ہو چکے ہیں جنہیں پہلی بار شیخ عبدالقادر مدیر "مخزن" نے اوائل ۱۹۰۷ء میں شائع کیا تھا۔ پہلا اڈیشن کم عرصہ میں ہی ختم ہو گیا تو مرغوب ایجنسی لاہور نے بہ اجازت شیخ عبدالقادر، ان خطوں کو دوبارہ مارچ ۱۹۰۷ء میں سید جالب دہلوی کے دیباچہ کے ساتھ شائع کر دیا، جو اب کم یاب ہے۔

نوّے ۹۰ سال بعد اردو رائٹرس گلڈ نے تیسرے اڈیشن کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ توقع ہے یہ خطوط استفادہ کا باعث ہوں گے۔

(۲)

سید جالب دہلوی کا دیباچہ قیمتی ہی نہیں تاریخی بھی ہے۔ اس دیباچہ سے آزاد کی عالمانہ اور قلندرانہ زندگی کے کئی نئے گوشے اُجاگر ہوئے ہیں۔ بہت کم عمری سے ہی اشغال و اذکار کو اپنا لازمۂ زندگی بنا لیا تھا۔ "ذکر خفی و جلی اور ورد و نادِ علی میں مشق بہم پہنچائی تھی"۔ آزاد نے اسی ضمن یا سلسلۂ فکر و اعمال میں ہند اور بیرونِ ہند کئی سفر اختیار کیے تھے۔ "سیر ایران" ان کی ذکاوتِ باطنیہ کا آئینہ ہے۔ یہ "دیباچہ" امر و آز پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔

(۳)

ان خطوں کی کل تعداد ۲۸ ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی کتابوں کے ذکر کے ساتھ علمائے عصر کی تصانیف کا اشخاص و امراء اور اماکنات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مکاتیب آزاد جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں سید حسن بلگرامی کے نام کے ہی خطوط شامل ہیں۔ حالاں کہ اس کے قبل ۱۸۸۰ء میں "مکتوبات آزاد" شائع ہو چکی تھی جو خطوط انھوں نے دوستوں کو لکھے ہیں ان میں باہمی قربت محبت کا احساس روشن دکھائی دیتا ہے۔ شمس العلماء خان بہادر مولوی منشی ذکاء اللہ سے انہیں خصوصی طور پر تعلق خاطر تھا۔ ایسا خلوص کہ" آزاد لاہور سے پیدل ان سے ملنے دلی آئے۔" دیگر دوستوں میں سید حسن بلگرامی، حکیم محمد دین تاثیر، مولانا سید ممتاز علی، ڈاکٹر لائنر کے نام قابل ذکر ہیں۔ ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ان بے بہا خطوں کا مجموعہ ہے جسے آغا محمد طاہر نے ہی مرتب کیا ہے۔ اور کتاب سر عبدالقادر کے نام معنون کی گئی ہے۔ کتاب کا دیباچہ خواجہ حسن نظامی اور ناصر نذیر فراق دہلوی کا رقم کردہ ہے۔ دوسرے صفحے کو آزاد کی تصویر سے آراستہ کیا گیا ہے۔ محمد ابراہیم (فرزند آزاد) لالہ دونی چند دکیل اور ناصر نذیر فراق، وغیرہ کے نام بھی کچھ خطوط شامل ہیں۔

(۴)

مکتوبات آزاد سے قطع نظر اس وقت مکاتیب آزاد کا ہی ذکر مقصود ہے۔ یہ خطوط سید حسن بلگرامی کو اس وقت لکھے گئے ہیں جب موصوف امرتسر

میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ "مکاتیبِ آزاد" کی الگ تالیفی حیثیت ہے۔ ان خطوں میں رقعات عالمگیری، دیوان قاآنی، تحفۃ العوام، تقصیر حضوری، دیباچے رومی، ماثرالامرا، اخلاق جلالی، دیوان حافظ، برہان قاطع، نامۂ خسروان، آبِ حیات، نیرنگِ خیال، قندپارسی، قواعدِ پارسی، سخندانِ فارس، دیوان ذوق، دربارِ اکبری، سوانح اکبری کا خصوصی طور پہ ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح سرسالار جنگ، سید مصطفےٰ بلگرامی، جمال الدین خاں، مانی و بہزاد، گلبدن بیگم، ہمایوں، سلیمہ سلطان بیگم، زیب النسا، امام دین، چاند بی بی، قاآنی، غالب، ڈاکٹر لائٹر، قائم چاندپوری، اکبر، ملا دوپیازہ، بیربل، نواب سعادت علی خاں، مرزا دبیر، سید لائق علی، جلال لکھنوی، اسیر دہلوی، قاسم مشہدی، ظہوری، گرامی وغیرہ کا ذکر مختلف نوعیتوں سے کیا گیا ہے۔ کپور تھلہ، لاہور، امرتسر، بھوپال، رڑکی، کرنیک، حیدرآباد، جموں کا بھی ذکر خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان خطوں میں بھی زبان و بیان کی ہنرمندی، نقش گری اور تاریخیت موجود ہے۔ سنجیدہ اور علمی موقوں پر بھی اپنی تکیلی اور چٹکیلی ظرافت کی کچھ نہ کچھ نشانیاں ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ علم و ایقان کی اقداری صفات نے ان خطوں کو خزینۂ خاص کا درجہ بخش دیا ہے۔ چنانچہ اسی متبرکانہ بخشش نے نورِ ایقان کو موقّل رکھا ہے۔ یہ خطوط آج بھی تازہ اور شاداب ہیں۔

اب جو "دربارِ اکبری" کا مشاہدہ کرے گا یہ نہ کہہ سکے گا آزاد کو "ماثر" ہاتھ نہیں آئی۔

سحر کا نور، شفق کی سرخی، صبح کا عالم جب نظر آتا ہے۔ اہل دل کہتے ہیں سبحان اللہ۔

ایسی عورتوں کے حالات ہوں جو صاحب علم کے ساتھ صاحبِ تصنیف ہوں۔

"کتاب النسوان" انگریزی کا حال جو تحریر فرمایا ہے۔ میں سمجھ گیا۔ خدا اس دربار سے فارغ کر دے تو آپ سے سرخرو ہوں۔

اسی طرح سے مصالح اکٹھا ہوا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ عمارت تیار ہو جاتی ہے۔

یہ علم کی جڑیں (یونیورسٹی پنجاب) تعلیم پنجاب کو ہضم کیے جاتی ہے کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی ہے۔

دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رفاقت میں لو، تھوڑا کھاؤ اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خدا کریم کارساز ہے۔ وہ دینا چاہے گا تو اس کے ہزاروں ہاتھ ہیں۔

آبِ حیات اور نیرنگ خیال امتحان یونیورسٹی میں داخل ہو گئی ہیں۔

عقل ٹھکانے نہیں، حواس پریشان ہیں۔

میں آپے سے باہر ہو گیا ہوں اور ضعف نے نکما کر دیا۔

اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفا دے دیا ہے وہ تو اب تصنیفات میں غرق رہتا ہے۔ اکیلا ہے، کوئی رفیق اور مددگار نہیں۔

ہاں نیچری ہوں، مگر علی کا نیچری ہوں۔

عجب ہجوم محنت میں مبتلا ہوں، سخت تردد ہے، دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوں۔

بادشاہ کی بے پروائی یا عیاشی یا بدنیتی وغیرہ سے یا ارکانِ دولت کی بے لیاقتی یا نمک حرامی سے۔

آبِ حیات نے مجھے ہلاک کر دیا۔ ۱ مہینے کا کام ۱۲ مہینے میں کیا۔

طمع کا منہ کالا ہے۔ آزاد روپیہ کا لالچی نہیں۔

رات کو ایک بجے، دو بجے بیٹھ کر باتیں کیا کرتا ہوں یہ ابنائے زبان اخوان الشیاطین جو زندہ ہیں ان سے تو اس کی (مراد اکبر بادشاہ) باتیں بہرحال بہتر ہیں۔

"دربارِ اکبری" کو لپیٹ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔ آنکھوں نے رنگ بدلا ہے اور دماغ جواب دینے لگا۔

جو کام باقی ہے وہ فقط اتنا ہے کہ کہیں کوئی فقرہ بڑھا دیا۔ کہیں دو کو ایک کر دیا۔ کہیں کوئی لفظ بدل دیا۔ کہیں پس و پیش کر دیا۔

میں ہمیشہ یک رُخ بازی کھیلا ہوں اور خدا چاہے تو یہی چال چلوں گا۔

اب میں ہوں اور نامۂ اعمال

اگر مناسب جانیں تو ذرّہ کو نظرِ خورشید تک پہنچائیں فقط خوشی مطلوب ہے جو ہر مصنّف کو اپنے کلام کے پھیلانے میں ہوتی ہے۔

مجھے تو ڈر ہے کہ انتظام موجودہ کی تعلیم میں لڑکے بدمذہب نہ ہو جائیں۔

دولت کی محبت انسان کی سرشت میں داخل ہے۔

کیوں کر آپ کے دل میں اعتبار پیدا کروں۔

آزاد کو ۵۰ روپیہ پنشن بھی ہو جائے تو ہزار ہزار شکر خدا کا بجالائے اور بغلیں بجا بجا کر رقص کرے گا۔

برابر خط چلے آتے ہیں کہ فرمائیے "دربار اکبری" کا کیا حال ہے۔ قند پارسی کیا حال ہے۔ لکچروں کا کیا حال ہے یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آزاد کا کیا حال ہے۔

میں جیسا تھا ویسا ہی ہوں۔ نہ ساون ہرا، نہ بھادوں سوکھا۔

دمڑی کی بڑھیا، ٹکا سر منڈائی

میں نے کون سا پنجاب سے نکاح کیا ہوا ہے۔

جہلم سے لے کر پشاور تک سکھوں کا گورستان ہے۔

احمق کا قاعدہ ہے کہ اپنی تعریف سُن کر خوش ہوتا ہے۔ میرا یہ حمق حد سے بہت گزر گیا ہے کہ تعریف سن کر غصّہ آتا ہے۔

اپ کے ایک ایک فقرے کے جواب میں ایک ایک کتاب لکھوں۔

طرز بیان کو ہاتھ سے نہیں کھویا۔ مثالیں خوش آیند بہم پہنچائی ہیں۔

خدمت سے مُقصّر ہوں۔ عالم مجبوری ہے۔ آب حیات میں غوطے کھا رہا ہوں۔ ایک مہینے کا کام اور ہے۔

دانائی یہی ہے، کہ اپنی آگاہی اور لیاقت دبائے ہوئے سب کے ساتھ بلکہ پیچھے پیچھے چلے چلیں

انشاءاللہ اردو میں ایک ڈرامہ لکھ کر میں بھی نمونہ دوں گا۔

اتنی تعداد میں مثالیں دے کر کہنا مقصود یہی ہے کہ آزاد نے کہیں ذہنی یا فکری غلامی قبول نہیں کی اور نہ تقلیدی پیرایہ اختیار کیا۔ نہ لباس میں، نہ وضع قطع میں، نہ احساس میں، نہ خوشی میں، نہ تحریر میں، نہ ابلاغ و ترسیل میں۔ وہ خود کار رفتہ

خلق وتخلیق کے شیدا تھے۔ اسی لیے ان کے ہاں "لفظا" شاکر دکھائی دیتا ہے شاکی نہیں۔ اسی جادو نے ان کے اسلوب کو سحر طراز بنا دیا ہے۔ انبوہ، دانہ دانہ، قطرہ قطرہ، کفر، نوبت، پاک نہاد زمین، جسارت، غائبانہ عقدہ، سایہ، سرمایہ، محذور، استمزاج متحد، یک خانہ، تخفیف، قناعت، متمتع، اوصاف، تازہ، شیوہ، یادگار، سائل، آواز، تماشہ، طمع، عذر، مراتب، تصدق، رعایت، مبادا، صبر، فقرہ اور تہمت بے زبان نہیں۔

خدا کا فضل، خدا کی درگاہ، استغفراللہ، یااللہ، مولا، توبہ، بحقِ محمدؐ و آلِ محمدؐ، خدا و مولا، اسداللہ الغالب، یاعلی مدد، علی کا نیچری، دنیا و مافیہا، نعوذباللہ، انشاءاللہ، الحمدللہ، اعلیٰ علیتین وغیرہ دینی اساس اور طہارت قلبیہ کے اشاری زاویے ہیں۔ یہی نہیں انہوں نے سوشلائزڈ، ڈڈیکیشن، واکیوبلیری، پالیسی ڈائلاگز وغیرہ انگریزی لفظوں کا استعمال بھی بے تکلفی سے کیا ہے۔

محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال مناسب ہے۔ ان کے یہ خطوط ہماری قدر و تہذیب کا حصہ ہیں جسے سجا سنوار کر رکھنا لازم ہی نہیں فرض بھی ہے۔

حسبال احمد

الہ آباد

۲۷ر نومبر ۱۹۹۷ء

تمہیدِ طبعِ ثانی

مکتوبات آزاد جس کا سلسلہ مخزن۔ اپریل ۱۹۰۶ء سے شروع ہوکر چھ سات مہینے تک برابر دلچسپی سے جاری رہا۔ دراصل میجر سید حسن بلگرامی صاحب بالقابہ کے نام ہیں۔ میجر صاحب موصوف نواب عماد الملک مولوی حسین بلگرامی کے برادر عزیز اور مشہور خاندان بلگرام کے رکن ہیں۔ آپ انڈین میڈیکل سروس کے سند یافتہ اور عرصہ تک فوجی ڈاکٹر رہے۔ ایک دفعہ حسن اتفاق سے میجر صاحب بہ سلسلۂ ملازمت امرتسر میں مقیم تھے اور یہ خط وکتابت بھی ان ہی دنوں کی ہے۔ قریباً بارہ برس ہوگئے ہیں کہ دفتر مخزن نے ۱۹۰۷ء میں ناظرین مخزن کے اصرار پر ان دلچسپ اور دلآویز تحریروں کو ایک مجموعہ کی شکل میں چھاپ کر ملک اور زبان پر احسان عظیم کیا تھا۔

چوں کہ پہلے ایڈیشن کا ایک بھی نسخہ باقی نہیں رہا اور شائقین کا دست خریداری ہندوستان کی ہر دل عزیز اور مقبول زبان کے سب سے بڑے ادیب اور مربی کے کلام بالا کلام کے لیے برابر دراز ہوتا دیکھ کر ہم نے اس مجموعہ کو شیخ عبدالقادر صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا و پبلک پراسیکیوٹر لائل پور کی اجازت سے دوبارہ اسی موزوں سائز پر خوبصورت ایڈیشن میں چھاپ دیا ہے۔ اردو زبان کے دلدادہ عموماً اور کلامِ آزاد کے فدائی خصوصاً قدر دانی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

مزید دلچسپی کے لیے مولانا آزاد کا فوٹو بھی چسپاں کیا گیا ہے جو کہ کتاب کی شان کو دوبالا کر رہا ہے۔

مولوی محمد حسین صاحب آزاد عربی فارسی میں اعلےٰ دست گاہ رکھتے تھے۔ فن شاعری میں ذوق مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ اردو لٹریچر (نثر اور نظم) میں ایک نئی روح پھونک دینا ان ہی کا کام تھا۔ بیسیوں کتابیں ان کی تصنیف و تالیف سے گھر گھر پھیل رہی ہیں۔ (مثلاً دربار اکبری، قندپارسی، سخندان پارس، نیرنگ خیال، قصص ہند، جامع القواعد وغیرہ وغیرہ) ان کے کارہائے نمایاں کے عوض جشن جوبلی میں ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی عربی کے پروفیسر رہے ہیں۔ آپ دس ماہ ذوالحجہ ۱۲۴۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۹ محرم الحرام ۱۳۲۵ھ (بوقت شب) اس دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔

مینجر مرغوب ایجنسی لاہور

دیباچہ مکتوباتِ آزاد

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی + کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کم و بیش بائیس برس کا زمانہ گزرتا ہے کہ راقم سطور ہذا نے جس کی عمر ان دنوں دس گیارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی حضرت آزاد کو اپنے وطن مالوف کے ایک خانہ باغ میں ٹہلتے ہوئے کمال ذوق و شوق کے ساتھ مندرجۂ بالا شعر پڑھتے سُنا اور مصرعہ ثانی کے پانچوں لفظوں پر یکے بعد دیگرے زور دے دے کر معانی مختلفہ کا مزہ لیتے دیکھا۔ مولانائے موصوف پر اس وقت ایک ایسی زبردست وجدانی کیفیت طاری تھی اور شعر مذکور کے الفاظ کچھ ایسے نرالے انداز سے ان کی زبان فیض ترجمان سے ادا ہو رہے تھے۔ نیز آپ کی حرکاتِ چشم و ابرو اور جنبشِ دست و بازو کچھ اس طرح محسوساتِ قلبی کا پتہ دے رہی تھیں کہ راقم الحروف باوجود اس کمسنی و ناسمجھی کے اس سے علیٰ قدر حال متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور شعر مرقومۂ صدر فوراً اس کے لوحِ دل پر "کالنقش علی الحجر" ثبت ہوگیا اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً خاص خاص موقعوں پر اسی موہوم تاثیر کے ساتھ یاد آتا رہا جو حضرت آزاد کے تقرّن نے اس میں پیدا کر دی تھی لیکن اس کے معانی کی جو پوری دل خراش و حسرت انگیز تشریح دس سال کے بعد خبر وحشت اثر سُن کر ہوئی کہ "مولانا آزاد نے بہ آں ہماں علائقِ روزگار محویت و استغنا کا آخری درجہ حاصل کر کے دکھا دیا اور صدماتِ پیہم سے تنگ آ کر دنیا و اہل دنیا کے تعلقات سے یک لخت ہاتھ اٹھا لیا۔ اس کا

اظہار بذریعۂ الفاظ کسی طرح ممکن نہیں۔ بس ع

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

کیوں کہ گو مولانا ئے موصوف نے سنِ رُشد و تمیز کو پہنچتے ہی عملی فوائد پر خیالی دلچسپیوں کو ترجیح دینی شروع کر دی تھی۔ اور اوائلِ شباب ہی میں اپنی طبیعت کا یہ نرالا رنگ معاصرین و احباب پر ظاہر فرما دیا تھا اور بیس بائیس سال کی عمر میں قدامت پرستی کو کھلم کھلا اپنا شعار خاص قرار دے لیا تھا۔ نیز صوفیائے کرام کے معتقدات میں جن دو عالموں جسمانی و روحانی یا سفلی و علوی کا الگ الگ آیا نہ ہوتا مذکور رہے۔ ان کی دیکھ بھال اپنے لیے ضروری ٹھہرائی تھی۔ اور اپنے اوقات گرامی کا ایک حصہ روحانیت پر غور کرنے اور دونوں عالموں کے ظاہری و باطنی تعلقات کا پتہ لگانے کے لیے مختص کر رکھا تھا اور دیانت و تصوف میں جو ریاضتیں تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کے لیے مقرر ہیں وہ محنتوں اور درویشوں کی صحبتوں میں رہ کر سیکھی تھیں۔ متعدد اشغال و اذکار کو اپنا لازمۂ زندگی بنایا تھا اور ذکر خفی و جلی اور وردِ نادِ علی میں وہ مشق بہم پہنچائی تھی کہ آپ کے سانس کی حرکات بعض اوقات پاس بیٹھنے والوں کو چونکا دیتی تھیں۔ غدر کے بعد کئی افتادیں آپ پر پڑیں اور ایک سے زیادہ مرتبہ آپ کی زندگی معرض خطر میں رہی مگر کوئی دقت یا صعوبت آپ سے یہ شوق ترک نہ کرا سکی۔ سفر کا آپ کو بارہا اتفاق ہوا مگر یہ سلسلہ ہر جگہ ساتھ رہا۔ خواہ آپ شمالی ہند و افغانستان میں پھرے خواہ ترکستان و ایران میں تشریف لے گئے مگر کہیں اس رفیق طریق کو جدا کرنا

گوارا نہ فرمایا اور دورانِ سیاحت میں برابر آپ کو یہ چیٹک لگی رہی کہ کسی پہنچے ہوئے اللہ والے بزرگ سے سابقہ پڑے جو اپنی توجہ سے ہستی کا اصل راز آپ پر منکشف کر دے اور عالم بالا کی سیر کے متعلق آپ کا دیرینہ اشتیاق پورا کرے جو حیرت انگیز د خوف العادۃ کرشمے مختلف مذاہب میں اہل باطن سے منسوب کئے جاتے ہیں ان کی حقیقت آپ کو جتائے اور فلاح دنیا رصلاحِ عقبیٰ کے لیے جن بزرگوں کا دامن آپ نے پکڑا ہے ان کی ارواحِ طیّبہ سے حسب دل خواہ فیض پہنچوائے۔ ایک طرف تو یہ خیالات تھے جنہوں نے سالہا سال کی پختگی سے عقائد کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اور دوسری جانب وجہ معاش میں بھی آپ کو تعلیم و تحقیق السنہ ہی سے واسطہ پڑا تھا اور اس کام میں جو تین زبانیں فارسی اردو اور ہندی آپ کا سرمایۂ امتیاز تھیں ان کے لٹریچر کا دار و مدار صرف شاعری پر آ کر ٹھہرا تھا۔ اس لیے آپ کی بود و باش زیادہ تر تخیل کی دنیا میں رہتی تھی اور شعرائے ہند و فارس کے نتائج افکار ہر وقت آپ کے انیسِ خلوت ہوا کرتے تھے اس لیے کوئی محلِ تعجب نہیں کہ جب اربابِ زمانہ کی ناقدری و بے وفائی اور دنیائے فانی کے مصائب و آلام کا سامنا ہوا تو ساکنانِ عالمِ خیال کی دل جوئی و مدارت سے مقابلہ پیش آیا تو آخر الذکر طمانیت و یکسوئی کا گلزار سراپا بہار دکھا کر اور سالہا سال بے غل و غش اس میں سیر کرنے کی امید دلا کر حضرت آزاد کی طبیعت کو اپنی طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہو گئے اور مولانائے موصوف جملہ تعلقاتِ دنیاوی سے منہ موڑ کر اور عقل و خرد کے ساتھ ہر ملکی لٹریچر کو رد یا چھوڑ کر یہ شعر پڑھتے ہوئے دیارِ تصور کے گلشنِ بے خزاں

میں پہنچے ۔

زہشیارانِ عالم ہر دیدم غمے دارد
دلا دیوانہ شو۔ دیوانگی ہم عالمے دارد

وہاں کی فضا کچھ ایسی آپ کے جی کو بھائی کہ آپ نے وہیں چھاؤنی چھالی۔ اور گذشتہ بارہ سال میں سوائے گاہ گاہ کی سرسری وغلط انداز نگاہ کے اس طرف مطلق التفات نہ فرمایا اور شائقین زبانِ اُردو کے لیے حسرت و یاس کا وہ عالم بہم پہنچایا کہ مشہور مصرع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

کا پورا مصداق اگر وہ سارے ہندوستان میں کسی کو پاتے ہیں تو جناب شمس العلماء مولانا ئے محمد حسین صاحب آزاد دہلوی سابق نامور پروفیسر السنہ شرقیہ گورنمنٹ کالج لاہور و گرامی قدر مصنف آبِ حیات و نیرنگِ خیال و دربارِ اکبری و سخندانِ پارس وغیرہ ہی کو پاتے ہیں اور جہاں پہلے مولانائے ممدوح کی زبان کو قلم سے پھول اور موتی جھڑتے دیکھتے تھے وہاں اب خود ان کی حالتِ زار پر اشک حسرت بہاتے ہیں۔ اُف ؎

پکارتی ہے خموشی مری فغاں کی طرح
نگاہیں کہتی ہیں سب رازِ دل زباں کی طرح

غور کیا جائے تو مولانا کی حالت کا یہ زبردست انقلاب کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں۔ کیوں کہ حکمائے مشرق و مغرب دونوں اس بارے میں متفق الرائے ہیں کہ دماغی کام کرنے والے اپنی محویت و استغراق سے یہ راستہ برابر طے کرتے رہتے ہیں اور شعراء تو بلند پروازیٔ خیال کی مدد سے اکثر اس کی سرحد کے لگ بھگ ہی پہنچ جاتے ہیں۔

چنانچہ ایک بڑا یونانی فلسفی لکھتا ہے کہ "اگر میں اپنے تمام خیالات لوگوں پر ظاہر کر دوں تو فی الفور پاگل قرار پاؤں"، گولڈ اسمتھ اپنے ایک مضمون میں زبان کی اس تعریف کو کہ "وہ اظہار خیالات کا ذریعہ ہے" غلط ٹھہراتا ہے اور بہ دلائل محکم ثابت کرتا ہے کہ یہ تعریف صرف حواس باختہ و مضطرب زدہ لوگوں ہی پر صادق آسکتی ہے۔ صحیح الدماغ اشخاص کے لیے زبان کی تعریف یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اس کی مدد سے اپنی اصلی حالت کو چھپاتے ہیں اور اکثر اوقات اپنے تلخ محسوسات کے بدلے اوپری معاملات لوگوں پر ظاہر کرتے ہیں۔ افلاطون مانتا ہے کہ ہر فرد بشر پر وقتاً فوقتاً دیوانگی کی حالت طاری رہتی ہے اور زیادہ تر یہ نامعلوم طریق پر ہوتی ہے۔ خصوصاً جو اشخاص تحقیقات و اختراعات کے در پے ہوتے ہیں وہ خود کو زیادہ اس کا مورد بناتے ہیں۔ حکیم ارشمیدس کا قصہ مشہور ہے۔ کہ حمام میں غسل کرتے وقت پانی کے حوض میں طاس کو ڈوبتے اور بقدر اس کے حجم کے پانی کو اچھلتے دیکھ کر معاً ترازوئے آبی کا خیال اس کے ذہن میں آیا اور فرط مسرت سے اس قدر مدہوش ہوا کہ فوراً "پالیا" "پالیا" کہتا ہوا ننگا حمام سے نکل بھاگا اور بادشاہ کے دربار میں جا داخل ہوا۔ یورپ کے اخبارات میں بہ ذیل "لطائف و ظرائف" آئے دن بڑے بڑے نامی پروفیسروں کی خود فراموشی کے واقعات چھپتے رہتے ہیں۔ لارڈ کیلون جو اس وقت نہ صرف انگلستان بلکہ دنیا کے چیدہ سائنس دانوں میں گنا جاتا ہے اس سے کئی بار ایسی حرکات سرزد ہو چکی ہیں کہ کوئی نادان بچہ بھی اتنا بھولکڑ نہ ہوگا۔ خود جناب آزاد کے نامور استاد ملک الشعرا خاقانی ہند حضرت ذوق مرحوم کی نسبت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ آپ چلم کے لیے آگ

لینے کو جو نکلے تو کسی شعر کی دھن میں ٹھیکرا ہاتھ میں لیے تہ بند باندھے۔ لوٹو طسی جوتی پہنے ایک رئیس کے دولت سرا تک چلے گئے اور ایک بار نہانے کے ارادے سے جو چلے تو اسی ہیئت کذائی سے قلعہ کے اندر پہنچ گئے۔ لوگ حیران و انگشت بدندان تھے مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ استاد شاہ کو ٹوک سکتا۔ آخر آپ سراپردۂ شاہی پر جا کر چوبدار کے سلام کرنے سے رُکے اور اس وقت آپ کو اپنی حالت کا ہوش آیا گھبرا کر باہر نکلنے کو تھے کہ اتنے میں یہ بات بادشاہ کے کان تک جا پہنچی حضور فوراً بہ نفسِ نفیس برآمد ہوئے اور بہ منت استاد کو اندر لے گئے اور بڑے اصرار سے وہ اشعار سُنے جنہوں نے حضرت ذوقؔ کو اس قدر وارفتہ دمحو کر دیا تھا۔ پھر جو استاد باہر نکلے تو گراں بہا خلعتِ شاہی زیب تن فرما کر نکلے۔ مرزا غالبؔ مغفور کے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ آپ کوٹھے پر رہا کرتے تھے اور نیچے دیوان خانہ میں محلّہ کے تمام بے فکرے آکر جمع ہوتے تھے۔ حقّہ پان وغیرہ سے ان کی تواضع کی جاتی تھی۔ اور جب کسی شاگرد یا رئیس کے ہاں سے میوے یا مٹھائی کی نذر یا سوغات آتی تھی تو اس میں بھی ان لوگوں کا ستہ لگتا تھا۔ ان بیٹھنے والوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ خواندہ۔ نیم خواندہ۔ جاہل خلیق۔ بدمزاج سب ہی طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ اور چونکہ اکثر لوگ گنجفہ۔ شطرنج۔ چوسر وغیرہ کا شغل رہتا تھا۔ اس لیے باتوں باتوں میں تکرار بھی ہو پڑتی تھی اور خوب غل مچتا تھا۔ جس کی آواز جب مرزا صاحب کے کان تک جاتی تھی تو وہ سمجھتے تھے کہ "ہاں دیوان خانہ آباد ہے"۔ اگر اتفاق سے کسی روز جمگھٹا نہ ہونے پاتا تھا یا شور و شغب کی نوبت نہ آتی تھی تو مرزا صاحب کچھ افسردہ سے ہو جاتے تھے اور ملازموں سے فرماتے تھے کہ

"دیکھنا میاں۔ آج محلّہ میں خیریت تو ہے۔ کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا۔" نوکر جنہیں لوگوں کی چلمیں بھرنی اور متفرق کام کرنے پڑتے تھے دل میں دعائیں مانگتے تھے کہ آج دیوان خانہ گرم نہ ہو۔ مگر جب مرزا صاحب کو بے چین دیکھتے تھے تو دل ہی دل میں سلگتے اور زبان سے کچھ بڑبڑاتے ہوئے لوگوں کے گھر پر جاتے تھے اور آواز دے کر کہتے تھے "بھئی چلو بڈھے کو سودے کا زور ہوا۔ چلو چل کر ادھم مچاؤ۔" لیکن یہ حالت ملازموں کی عارضی تھی۔ ورنہ درحقیقت ہر شخص ان کا عاشق و جاں نثار تھا۔ مرزا صاحب اپنی شاہ خرچی اور فیاضی کے باعث اکثر تنگ دست رہتے تھے اور نوکر بھی ان کے ساتھ پریشان ہوتے تھے۔ مگر کبھی کوئی ملازم حرف شکایت زبان پر نہ لایا اور بڑے بڑے رؤسا کے ہاں زاید تنخواہ پر کسی نے جانا نہ چاہا۔ خاص کر کلّو۔ کلّیان جنھوں نے اپنی خدمت کا سب سے بڑا صلہ یہ پایا ہے کہ مرزا صاحب کے رقعات مندرجہ اردوئے معلیٰ و عودِ ہندی نے صدیوں تک ان کے بقائے نام کا سامان کر دیا ہے۔ ان سے اس قدر مانوس تھے کہ کلّو نے ان کی وفات کے بعد پھر کسی کی نوکری نہیں کی۔ اور ساری عمر اُن کی یاد اور فاتحہ خوانی میں گزار دی۔ راقم الحروف نے کلّو سے بارہا مرزا صاحب مرحوم کے حالات سُنے ہیں مگر کبھی اُس نے ٹھنڈا سانس لیے اور سخت حسرت ظاہر کیے بغیر ان کا ذکر شروع نہیں کیا۔ دیوان خانہ میں بیٹھنے والوں کی نسبت وہ کہا کرتا تھا کہ جناب مرزا صاحب بعض اوقات دنوں نیچے نہ اترتے تھے اور ان کی صورت تک نہ دیکھتے تھے مگر وہ غل غپاڑہ گویا ان کی غذائے روح تھا جس کے بغیر انہیں کل نہ پڑتی تھی۔ ان لوگوں سے اگر وہ

کبھی کچھ کام لیتے تھے تو یہ لیتے تھے کہ جب کوئی نیا مضمون باندھتے تھے اور اس کی مسرت کے کیف میں بے خود ہو جاتے تھے تو نیچے تشریف لے آتے تھے اور وہ شعر لوگوں کو سناتے تھے۔ اور داد لے کر پھر الٹے پاؤں واپس چلے جاتے تھے کبھی ایسا موقع ہوتا تھا کہ دیوان خانہ میں چند ناخواندہ شخص جمع ہیں جو شعر کا مطلب تو درکنار اس کی ترکیب لفظی کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے مگر مرزا صاحب موصوف پر شوق کا وہ غلبہ ہوتا تھا کہ انہیں کو سناتے تھے ایک ایک لفظ کی تشریح کرکے بتاتے تھے۔ اور داد لیتے تھے۔ کلّو کا بیان ہے کہ کئی مرتبہ ایسا بھی دیکھا کہ دیوان خانہ میں چڑیا بھی نہیں لیکن مرزا صاحب آئے اور دروازہ میں کھڑے ہو کر آپ نے فرمایا "لو بھئی سنو۔ کیا مضمون ہاتھ آیا ہے"۔ اور پھر آپ نے شعر پڑھا اور اس کی مزید تشریح کی اور مطمئن ہو کر پھر کوٹھے پر چلے گئے۔ ملازم چونکہ ان عادتوں سے واقف تھے اس لیے خاموش رہتے تھے اور بعض اوقات کسی معمولی آدمی کو چپکے سے دیوان خانہ میں بھیج دیتے تھے تاکہ مرزا صاحب کی تکلیف رائیگاں نہ جائے اور وہ آزردہ نہ ہوں۔ حالانکہ اُن ہی مرزا نوشہ کی نازک دماغی کا یہ حال تھا کہ بعض موقعوں پر جناب نواب ضیاء الدین خاں مرحوم نیّر درخشاں اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم اور نواب علاء الدین خاں علائی مغفور جیسے رؤسائے بلند پایہ منتیں کرتے کرتے تھک جاتے تھے اور وہ ایک مصرع تک زبان پر نہ لاتے تھے۔ اللہ اللہ سچ کہا ہے کہ شاعر اپنے رنگ میں بادشاہ سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ حکیم مومن خاں مغفور کا یہ عالم تھا کہ رستے میں چلتے چلتے خود بخود ٹھٹک جاتے تھے اور پھر

چلنے لگتے تھے۔ ایک دو شاگرد یا معتقد ساتھ لپٹے رہتے تھے کہ کہیں کسی گاڑی گھوڑے کی زد میں نہ آجائیں۔ پھر بھی ایسا ہوا کہ کئی بار چوٹ کھائی اور کئی بار گرتے گرتے بچے۔ آپ کے ہاتھ کی جنبش اکثر اس خیال کو پتہ دیا کرتی تھی۔ جس میں آپ غرق ہوتے تھے کبھی دونوں ہاتھ بھی چلتے تھے۔ ایک شاہزادہ صاحب کا بیان ہے کہ کلاں محل میں ایک بالاخانہ پر ہم چند احباب کی نشست رہتی تھی۔ حکیم صاحب بھی گاہے گاہے قدم رنجہ فرماتے تھے اور چونکہ ہم میں قریب قریب سب تعلیم یافتہ اور مذاق سخن کے دل دادہ تھے اس لیے اپنا کلام بھی سناتے تھے۔ ایک روز میں بالاخانہ کے چھجے پر بازار کے رخ بیٹھا تھا دور سے دیکھتا کیا ہوں کہ جناب حکیم صاحب جھومتے جھامتے چلے آرہے ہیں۔ مگر آپ کا دایاں ہاتھ عجب انداز سے ہلتا جاتا ہے جیسے کوئی کسی چیز کو جھٹکتا ہو۔ جب کوٹھے کے نیچے آئے تو میں نے آواز دی کہ "تھوڑی دیر کے لیے قدم رنجہ فرمائیے" مگر انہوں نے مطلق اعتنا نہ فرمایا۔ میں نے پھر بلایا اور جب دیکھا کہ یہ سنتے ہی نہیں تو خود نیچے اتر گیا مگر آپ آگے بڑھ گئے تھے۔ میں نے دبے پاؤں آپ کے قریب جا کر سنا تو اس مصرع کی تکرار فرما رہے تھے۔ ع

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

میں نے کہا "اچھا حضرت پھر ہم سے بھی گلے ملتے جائیے۔ خدا خیریت سے واپس لائے" اس پر آپ نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا دیئے۔ حکیم صاحب مغفور کی ایک یہ بھی عادت تھی کہ راتوں کو دو دو تین تین بجے سوتے سوتے اٹھ کر باہر نکل آتے تھے

اور جس طرف منہ اٹھتا تھا چل دیتے تھے۔ لوگوں کو خبر ہوتی تھی تو تلاش میں نکلتے تھے۔ یہ حالتیں ظاہر کرتی ہیں کہ شعراء کو بے خودی و خود فراموشی سے اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے مگر ان حضرات میں یہ حالتیں عارضی ہوتی تھیں اور حضرت آزاد کے معاملہ میں ملک و زبان کی بدقسمتی سے انہوں نے استقلال کا درجہ قبول کرلیا ہے! اور فرط استغراق سے یہ عالم بہم پہنچا ہے کہ گھنٹوں اور دنوں تو درکنار ہفتوں اور مہینوں بھی آپ اپنے آپ میں نہیں آتے۔ اللہ اللہ شاہد حقیقی کی کیسی تلاش ہے کہ اس میں خود ہی کو بالکل گم کر دیا ؎

کھویا گیا ہوں دے کے پتا نامہ بر کو میں
اپنی خبر کو جاؤں الٰہی کدھر کو میں

درحقیقت حضرت آزاد اور زبانِ اردو دونوں کی بدقسمتی تھی کہ آپ نے ایسا بُرا زمانہ پایا جبکہ لوگ ایشیائی تہذیب کو علی وجہ الکمال نباہنے کا اپنے میں سکت نہ پاتے تھے۔ اور مغربی رنگ سے اچھی طرح آشنا نہ ہوئے تھے۔ اس لیے جناب آزاد کو اپنی مساعیٔ اصلاح و ترقی زبان میں سالہاسال بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پرانے فیشن کے بزرگوار آپ کے نیچرل مذاق کا پورا لطف اٹھانے اور سادگی و بے ساختہ پن کو تصنع و آرائش پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہ ہو سکے اور انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب یورو پین خیالات کے اس قدر پیچھے پڑے کہ انہیں جناب آزاد کی نظم و نثر مغربی چاشنی کے ساتھ بھی بہ خوبی مطبوع نہ ہوئی اور ان کی زبان گویا نمک ہستی کا چٹخارہ ہی بھول گئی اس لیے

جناب آزاد نے اردو لٹریچر خصوصاً نظم کا جو اعلیٰ ذخیرہ بڑی محنت و لاگت
سے فراہم کیا تھا وہ پورے طور پر استعمال نہ ہو سکا۔ اور آبِ حیات جیسی
نادر تصنیف جس جانکاہی و مغز پاشی سے تیار کی گئی ہے اس کی ملک سے پوری
داد نہ ملی اور ابتدائی اڈیشن کی جو جلدیں نکلیں بھی وہ سر رشتۂ تعلیم کی عنایت
سے مدارس کی انعامی کتابوں میں نکلیں اور نیرنگِ خیال تو اس میں داخل ہونے
کی وجہ سے بکی۔ مگر اس سے مولانا کا مدعائے دلی حاصل نہ ہونے پایا اور
وہ بجائے شگفتہ کے شکستہ خاطر ہو گئے۔ اور بعد کے صدمات کی تاب نہ لا سکے
اس لیے پبلک کی لاپروائی کا نہایت مضر و ناگوار نتیجہ یہ نکلا کہ ملک نہ صرف
مولانائے ممدوح کی تلاش و تحقیق کے دیگر دلچسپ و کارآمد نتیجوں اور طبع
آزمائی و خامہ فرسائی کے قیمتی و دلآویز نمونوں سے جن میں سے بعض قریباً مرتب
ہو چکے تھے۔ اور بعض کا خاکہ آپ کے ذہن رسا میں کھنچا ہوا تھا۔ محروم ہو گیا
اور آبِ حیات میں موعود اضافہ جو بسا ضروری تھا۔ نہ ہونے پایا بلکہ ناقابلوں کے ہاتھوں
میں پڑ کر الٹی اس کی مٹی پلید ہو گئی اور سب سے بڑھ کر مصیبت یہ پیش آئی کہ خود
مولانا ممدوح وہ آزاد نہ رہے ہائے ع

وہ چمن ہی اڑ گیا جس میں بہار آنے کو تھی

اگر ہومر کے ساتھ بے اعتنائی برتنے، ملٹن کو مبتلائے فلاکت رکھنے اور اس
کی معرکۃ الآرا تصنیف "پیراڈائز لاسٹ" صرف پانچ پونڈ کو بکوانے، جانسن
کو در در کی ٹھوکریں کھلوانے۔ خاقانی کو مے خانہ بھیجنے۔ ڈانٹے کو حسرت کی

موت مارنے۔ فردوسی کو شکست خاطر دنیا سے اٹھانے۔ حضرت میرؔ سے افلاس کے صدمے سہوانے۔ مصحفیؔ کا گذارہ غزلوں کی تجارت پر ٹھہرانے اور رودکیؔ کو جلا وطنی پر مجبور کرنے میں ان کے اہل وطن مورد الزام ہو سکتے ہیں۔ اور بے درد و ناقدر دان قرار پا سکتے ہیں۔ تو مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ حضرت آزادؔ کی طبیعت کے اس دردناک و حسرت انگیز انقلاب کی ذمہ داری بھی اردو زبان کے برتنے والوں پر عاید ہوتی ہے اور شمالی ہند کے باشندے اخلاقی طور سے اس کے جواب دہ سمجھے جا سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنی زبان کے سب سے بڑے محسن و مربی اور لٹریچر کے رفارمر کی پوری قدر نہ کی اور اسے اتنا خوش حال و فارغ البال نہ بنایا کہ وہ معمولی حوادث روزگار کا مقابلہ کر سکتا اور مالی نقصانات و قلبی صدمات کو خاطر میں نہ لاتا۔

یہ مانا کہ جیسا میں اوپر لکھ آیا ہوں اس ناگوار تبدیلی کے اسباب ابتدا سے اس کی طبیعت میں موجود تھے۔ مگر ان کی موجودہ سقیم حالت کی جو فوری وجوہ بتائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض مثلاً امانت کا روپیہ ڈوبنا۔ کتب خانہ میں آگ لگنی۔ اختلاج قلب کا زور ہونا۔ یقیناً ایسی ہیں جو خوش حالی کی صورت میں یا تو ٹل جاتیں یا اس قدر مضرت انگیز نتیجہ نہ پیدا کرتیں مگر ع

اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

خدا بھلا کرے ڈاکٹر لائٹنر کرنل ہالرائیڈ وغیرہ نیک نہاد شریف افسران سررشتہ تعلیم پنجاب کا جنھوں نے قصص ہند حصہ دوم۔ نیرنگ خیال۔ جامع القواعد اور

مثنویات بھی مولانا آزاد سے لکھوا کر چھپوالیں اور آبِ حیات کی تالیف و اشاعت میں بالواسطہ سہارا دیا۔ اور دربارِ اکبری کی تیاری کا سامان پیدا کیا ورنہ اگر مولانا کی دوسری تصانیف کی طرح کہیں ان کتابوں کا نکلنا بھی اہل ملک کی اعانت پہ منحصر ہوتو شاید دہلی و لاہور کے باہر کوئی آزاد کا نام بھی نہ جانتا۔ اور دوسری کثیر التعداد مثالوں کی طرح ان کا سرکاری خطاب "شمس العلماء" بھی محض مقامی وقعت رکھتا اور ان کے مسودات جھینگروں اور دیمک کی خوراک بننے کے سوا کسی کام نہ آتے۔ جیسا کہ انگلستان کے نامور شاعر "گرے" نے اپنی مشہور عالم نظم "ایلجی" میں لکھا ہے "بیسیوں آدمی شیکسپیئر اور ملٹن کا سا دل و دماغ لے کر منصۂ عدم سے عرصۂ شہود میں آئے مگر نامساعدت زمانہ نے ان کے ارمان دل کے دل ہی میں رکھے اور آخر انہیں خاک میں ملا دیا۔" لیکن جناب مولانا آزاد کے معاملہ میں بڑی دردناک اور حسرت انگیز بات یہ ہے کہ پہلے تو عرصہ دراز تک ملک نے ان کے فیوض و کمالات کا پورا اعتراف کیا اور ان کی قدر شناسی و حوصلہ افزائی کا سہرا صرف پنجاب گورنمنٹ کے سر رہا لیکن جب ابنائے وطن کو اس جوہرِ قابل کی کچھ پرکھ آئی اور اس کے شمشہ ان کے دلوں میں گھر اور تاریک کلبۂ خاطر کو منور کرنے لگے تو متواتر صدمات و آلام سے اس پر گرد کدورت چھا گئی اور گو فیض کی کرنیں نکلنی موقوف نہیں ہوئیں۔ مگر بندہ کر پڑنے کی بجائے متفرق ہو کر گرنے لگیں۔ جس کی وجہ سے وہ روشنی مدھم کیا بالکل ہی ماند ہو گئی۔ افسوس قدردانِ اردو اب ان دل نشین فقرات کے لیے تلملاتے اور مولانائے ممدوح کے نتائجِ افکار کی دید کا بے حد اشتیاق جتاتے ہیں مگر اب کیا ہو سکتا ہے جو مولانا کے

قیمتی مسودات ان کے ہراس کی طرح منتشر ہو کر زبانِ حال سے اپنے مصنف کی بیتا
سُنا رہے ہیں اور شائقین اردو پر سچا الزام لگا رہے ہیں کہ ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مولانائے ممدوح کی زیارت اب ساکنین لاہور کے لیے بمقابلۂ سابق بہت آسان ہوگئی ہے۔ اور ہر کس و ناکس ان کی ہم کلامی کا شرف بآسانی حاصل کر سکتا ہے۔ کیوں کہ آپ برابر پھرتے رہتے ہیں اور اپنی عادت مستمرہ کے موافق اکثر صبح کو مختلف مزارات پر بھی جاتے ہیں۔ سوائے خاص خاص موقعوں کے جبکہ آپ کسی خاص دھن میں ہوں۔ عموماً ہر شخص کی بات کا جواب کبھی مرحمت فرماتے ہیں۔ اور اسی طرح صحیح اردوئے معلّٰے کے الفاظ آپ کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ وہی انداز گفتگو۔ وہی طرزِ ادا۔ وہی لب و لہجہ، وہی محاورات۔ وہی امثال۔ وہی برمحل و برجستہ اشعار کی چاشنی۔ اس وقت بھی آپ کے کلام میں موجود ہے بلکہ صداقت نے درد اور بڑھا دیا ہے اور زمانہ سازی کی الجھنوں سے آپ کو چھڑا کر بے ساختہ پن پیدا کر دیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ خیالات میں ایک تسلسل نہ ہونے سے یہ ساری خوبیاں ہیچ ہیں۔ دو چار فقروں کے بعد سلسلۂ گفتگو کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے اور سامع ربط کو ٹٹولتا رہ جاتا ہے۔ بعض اوقات کوئی لفظ آپ کو کسی خاص واقع کی یاد دلاتا ہے اور بلا ضرورت اس کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے مگر بہت کم وہ خاتمہ تک پہنچتا ہے۔ چوں کہ معلومات کی غیر معمولی وسعت اور الفاظ کی حد سے زیادہ کثرت نے ایک نہایت فراخ میدان آپ کے لیے

ہٹا کر رکھا ہے اس لیے ذہن پوری آزادی سے اس میں دوڑتا پھرتا ہے اور ایک دوسرے تک پہنچنے نہیں پاتا کہ دوسری طرف کوئی رنگین پھول دیکھ کر اُدھر مُڑ جاتا ہے اور ادھر جاتے جاتے پھر پلٹ پڑتا ہے گویا آپ کا عنقائے خیال ہر وقت فضائے لامکاں میں پرواز کرتا رہتا ہے اور کبھی کبھی زمین کی طرف متوجہ ہو کر نیچے اترنا شروع کرتا ہے کہ فطری رفعت پسندی پھر اس کا رخ بدل دیتی ہے اور اوپر اٹھا لیتی ہے یوں کسی کے عقل کے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ اس تیز پری و بلند پروازی میں مولانا کے خیال کا ساتھ دے اور اس عجیب و غریب نظاروں کا لطف اٹھائے جن لوگوں کو آپ کے مذاق اور عادات سے آگہی ہے اور جو آپ کے سوانح عمری سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کا ذہن بھی تھوڑی دیر میں تھک کر رہ جاتا ہے اور مولانا کے توسن فکر کی گرد کو بھی نہیں پاتا۔ واقعی اس بارے میں آپ کا یہ فخر کہ ؎

میں ہوں وہ نوردِ شوق میرے ساتھ جانا ہے
نشانِ سایۂ مرغِ ہوا نقشِ قدم میرا

بالکل بجا ہے مگر واۓ بر حال ہم بد نصیب مشتاقوں کے کہ ان نکات کو نہیں سمجھ سکتے اور ایجاد و اختراع کی جو زبردست قابلیت آج کل آپ میں آگئی ہے اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ البتہ آپ کی باتوں کا کچھ اثر ہوتا ہے تو رنج و حیرت کا ہوتا ہے اور سناٹا سا آجاتا ہے۔ راقم سطور ہذا کو چونکہ زمانہ طفولیت میں مولانا صاحب کی نصیحت آمیز گھڑکیاں جھڑکیاں کھانے کا اتفاق ہوا اور ان گھروں میں اس نے پرورش پائی جن کے بزرگ مکینوں کو پہلے سلطنت مغلیہ کے

ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی آخری جھلک دیکھنے اور اس یادگاری زمانہ کے اہل کمال کی کی صحبتیں اٹھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اور اب فلاکت و ادبار کے ہاتھوں صرف یاد آیام کا شغل باقی رہ گیا تھا۔ اس لئے بہت سی باتیں اس کے کان میں پڑیں جن کی وجہ سے حضرت آزاد کی لٹریری کوششوں اور جانفشانیوں کے متعلق ایسے نہ صرف وہ حالات معلوم ہوئے جو ان کی کتابوں سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ بہت سے خاص امور کا پتہ لگا جنہوں نے مولانا کی عظمت دل پر نقش کر دی۔ اور زبان کے ایک زبردست محسن اور انشاپرداز کی گرامی قدر ریفارمر کی حیثیت میں ان کی خاص عقیدت قائم کی جس کے اثر سے اب یہ کیفیت بہم پہنچی ہے کہ جب کبھی چلتے پھرتے آزاد کی نورانی صورت نظر آجاتی ہے تو طبیعت پر عجب عالم طاری ہوتا ہے اور ملک و قوم خصوصاً اردو زبان کی شومیٔ بخت و محرومیٔ قسمت کے احساس سے دل بے اختیار دھڑکنے لگتا ہے۔ جسم میں سنسنیاں ہونے لگتی ہیں۔ اور جو الفاظ مولانا کی زبان سے نکلتے ہیں وہ تیر کی طرح سیدھے کلیجے میں جا کر بیٹھتے ہیں اور فوراً ان کے استاد کا یہ شعر جسے انہوں نے خود آب حیات میں نقل کیا ہے۔ یاد آجاتا ہے کہ ؎

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے!!

خاص کر ایک روز کی بات تو عمر بھر نہ بھولے گی جبکہ غالباً اواخر ۱۹۰۴ء میں راقم اپنے مخلص دوست مسٹر سید محمد ایڈیٹر اخبار الحق کراچی کے ساتھ بیٹھا ہوا دلی دروازہ

کی طرف جا رہا تھا۔ مسٹر موصوف اس سے پہلے کئی بار حضرت آزاد کی زیارت کا اشتیاق ظاہر کر چکے تھے اور اس وقت بھی یہی کہہ رہے تھے کہ اتنے میں مولانائے موصوف محض اتفاقیہ دوسری طرف سے ٹہلتے ہوئے آ گئے اور دفتر اخبار ابزرور کے عین مقابل ہماری یکایک ان سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ مولانا کسی خیال میں محو تھے۔ اس لیے انہوں نے کچھ توجہ نہ فرمائی مگر راقم نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور بلا حصول اجازت مسٹر سید محمود کو آپ کا نام و نشان بتا دیا۔ جس پر وہ بہت خوش ہوئے اور بڑے شوق سے آپ کو دیکھنے لگے۔ لیکن سوء اتفاق کہیئے یا کیا کہ گو میں نے مولانا کا نام بہت ہی آہستہ بلکہ قریباً زیر لب کہا تھا اور اشارہ تک نہ کیا تھا مگر خدا جانے کس طرح مولانائے ممدوح نے سن لیا کہ چار قدم جا کر آپ پھر پلٹے اور مسٹر سید محمود سے جو کمال حیرت اور اس سے زیادہ کہیں زیادہ حسرت کے ساتھ "شمس العلماء پروفیسر آزاد دہلوی کی چلتی پھرتی ہنستی بولتی تصویر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔ فرمایا "میاں اس لڑکے نے غلط کہا۔ آزاد بھلا کہاں ہے" اتنا کہہ کر آپ تو پھر آگے بڑھ گئے مگر راقم کے دل پر آپ کے سہ لفظی جملہ " آزاد بھلا کہاں " نے گویا بجلی گرا دی اور حسرت و اندوہ کا وہ اثر پیدا کیا کہ تھوڑی دیر کے جہان نظر میں سیاہ ہو گیا اور ہجوم خیالات سے دم رکنے لگا افوہ۔ ہندوستان جنت نشان جیسے ملک کی مشترکہ و ہر دل عزیز زبان کا سب سے بڑا ادیب اور اس کی یہ نوبت ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو !

کامل چوتھائی صدی کی حوصلہ فرسا محنت سے ایک بزرگ شخص نے سخت تردّد کے بعد اردو کی اراضی میں فلسفیانہ و نیچرل خیالات کی تخم ریزی کی اور اپنے خونِ جگر سے اُسے سینچا۔ مگر جب کھیتی کی حفاظت کا وقت آیا تو بلسانِ عضوِ معطّل بے کار ہو گیا اپنی تنہا ہی دماغ پاشی کا کچھ ثمرہ حاصل نہ کر سکا۔ یہی نہیں بلکہ پیداوار بھی مقدار میں کم رہی اور جنس ویسی اعلیٰ درجہ کی نہ ہوئی جیسی اس کی مزید سعی سے مقصود تھی حیف ؎

قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

لوگوں کو امید تھی کہ آبِ حیات کے چشمہ سے مولانائے ممدوح کوئی اور نالی کاٹ کر لائیں گے۔ اور دورِ آخر کے نامور شعراء کو اس سے سیراب کر کے زندگیٔ جاوید بخشیں گے۔ دربارِ اکبری کو بڑی رونق و شان سے سجائیں گے اور اس کے مینہ بازار کی زمانۂ حال کے لوگوں کو سیر کرائیں گے۔ خیابانِ فارس کی چمن بندی از سرِ نو فرما کر اس میں نئے گل بوٹے کھلائیں گے۔ نیرنگِ خیال کے نئے تماشے دکھائیں گے۔ ہندوستان کی گذشتہ باکمال خواتین کو کسی مرقع کے محل میں بسائیں گے۔ تاریخِ ہند بہت سے شاندار مناظر نئی نسل کے روبرو پیش کریں گے اور آخر میں زبان کو اصطلاحاتِ علمیہ کا زیور پہنائیں گے جس کے ارادے وہ وقتاً فوقتاً ظاہر فرماتے رہتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ فلکِ بد نہاد کی کینہ توزی سے تمام امیدوں پر یک لخت پانی پھر گیا۔ اور مایوسی کا یہ مرتبہ بہم پہنچا کہ اب دفترِ مخزن نے جو

مولانا آزاد کے یہ تھوڑے سے خطوط کتابی صورت میں شائع کئے ہیں ان کو ہم
آپ کا ایک قابل قدر تبرک سمجھتے ہیں اور ملک وزبان کے حق میں ایک احسانِ
عظیم سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ ان مکتوبات کے ذریعہ سے رسالہ مخزن نے نہ صرف
مولانا کی بے تکلفانہ تحریر کا ایک دل آویز نمونہ شائقینِ اردو کو دکھایا ہے بلکہ
بالواسطہ اُن کی پُر حوادث مگر قیمتی زندگی کے حالات کا وہ دلچسپ حصہ بہم پہنچایا ہے
جس کا مہیا ہونا خود حضرت آزاد سے بھی نظر بحالاتِ موجودہ سخت دشوار تھا۔

اہل ملک کی غفلت یا تنگ دلی بھلا اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ
کامل چھ ماہ تک ان مکتوبات کی اشاعت کا سلسلہ مخزن جیسے دقیع نامور
رسالہ میں جو ماشاء اللہ ہندوستان کے ہر حصہ میں قابل ہاتھوں میں جاتا ہے۔
برابر جاری رہا اور لائق ایڈیٹر کی جانب سے دوبار یارانِ نکتہ داں کو صلائے
عام دیا گیا کہ جن اصحاب کے پاس حضرت آزاد کے کچھ خطوط موجود ہوں وہ انہیں
گمنامی کی تاریکی سے نکال کر شہرت کی روشنی میں لائیں اور اُن پر تمام
شائقینِ اردو کا حق استفادہ تسلیم کر کے مولانا کی سوانح عمری لکھنے والے کے
لیے معلومات کا ایک کار آمد ذخیرہ جمع کرنے مدد دیں مگر کسی بندۂ خدا نے
حامی نہ بھری۔ حالانکہ مولانا کی خط و کتابت جس قدر وسیع تھی اور صرف آب
حیات ہی کی تالیف کے زمانہ میں شعراء و ادبائے نامہ و پیام کا جو سلسلہ
کئی سال تک انہوں نے قائم رکھا تھا۔ اس کے دیکھتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ
کسی اور شخص کے پاس ان کی تحریریں نہ ہوں اور ان میں معمولی سے معمولی

باعتبار صفائی زبان یا افادت مطالب دل آویزی کی شان نہ رکھیں مگر افسوس ہے کہ لوگوں کو توجہ و پروا نہیں اور جو معدودے چند حضرات ان خطوط کی قدر جانتے بھی ہیں وہ انھیں ضرورت سے زیادہ عزیز رکھتے اور ان کے دکھانے میں بخل سے کام لیتے ہیں جس سے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے ملکی و قومی کمالات کو مٹانے اور ہماری قدیم صنعتی عظمت کو نقصان پہنچانے والی ثابت نہیں ہوئی۔ حسرت کی بات ہے یا نہیں کہ جس ادیب نے اپنی آب حیات کے ذریعہ سے اساتذۂ قدیم و متاخرین کے ناموں کو زندہ کیا۔ زبان اردو میں بیاگرافی کی بنیاد ڈالی اور انشا پردازی کے جنگل میں تذکرہ نویسی اور وقائع نگاری کی ایک سیدھی پٹیا نکالی جس پر اب سیکڑوں اہل قلم چل رہے ہیں۔ اور اپنی ہمت سے اسے متاثر بناتے جاتے ہیں۔ اس کے حالاتِ زندگی کا ہمیں تھوڑا بہت علم نہ ہو حالانکہ ابھی وہ بہ فضلِ خدا ہم میں جیتا جاگتا موجود ہے اور اگرچہ سرپرستان زبان کی مساعی حسنہ کے اظہار اور شعرائے ماضی کے قیام یادگار کی کوشش نے بہ خوبی مشکور ہو کر اس کے لیے بقائے نام و شہرتِ دوام کا سامان کر دیا ہے۔ مگر ہم اپنی طرف سے اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوئی صورت نکالیں۔ یورپ میں کئی صدیوں سے خوشحالی و اقبال مندی کا دور چلا آتا ہے اور علوم و فنون کی ہر شاخ میں حد سے زیادہ ترقی ہو رہی ہے۔ اس لیے وہاں ملک و زبان کے محسنوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ اور ہر زمانے میں ایک سے ایک بڑھ کر اہل کمال پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر

اس افراط پر بھی وہاں کے لوگ قدر شناسی و حوصلہ افزائی سے نہیں تھکتے اور دامے درمے قلمے قدمے برابر اپنے شعرا و مصنفین کی خدمت کیئے جاتے ہیں اور اگر بعض با کمالوں کے ساتھ ان کے زمانے میں قدرے بے اعتنائی برتی گئی ہے تو اس کی تلافی اس گرم جوشی و فراخ حوصلگی سے کر رہے ہیں کہ ان بزرگوں کی روح بھی وجد کرتی ہوگی مگر وائے بر حال ہم اہلِ ہند و شائقینِ اُردو کے کہ ہماری تعداد بفضلِ خدا با ہ پندرہ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور محسنینِ زبان تعداد سیکڑوں تک بھی نہیں پہنچی مگر ہم ان کے شکریۂ احسان سے نہایت شرمناک طریق پر قاصر ہیں۔ اور ایک طرف حضرت آزاد اپنی درد انگیز حالت سے ابنائے وطن کی بے اعتنائی کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ اور دوسری جانب استادانِ ریختہ کے شکستہ مزار زبانِ حال سے فریاد کر رہے ہیں سہ

تو بکارِ کسے نمے آئی ؛ بکنارِ کسے نمے آئی
بچہ اُمید میتواں مُردن ؛ بمزارِ کسے نمے آئی

میرے نزدیک مکتوباتِ آزاد کی اشاعت میں دفتر مخزن کی سعی مشکور ہوگی۔ اگر وہ اس عام بے التفاتی کی شکایت کو رفع کر سکے اور اُردو والوں کو فرائضِ خدمت زبان کے احساس پر مائل کرے!

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ.

لاہور ۱۹ مارچ ۱۹۰۷ء سید جالب دہلوی

۳۹

مکتوباتِ آزاد

لاہور مستی دروازہ

۲۶ ستمبر ۱۹۰۶ء

عالی جنابِ من زاد اجلالکم

تسلیم۔ عنایت نامہ باعثِ اعزاز ہوا۔ رات کو دس بجے میں گھر پہنچا۔ اس وقت خطوط اور کارڈوں کا انبوہ سامنے ہے دل دربار میں ہے اور دو دو حرفوں میں سب کو ٹال رہا ہوں۔ آپ کی تحریر کا جواب فرصت چاہتا ہے۔ مجھے کہاں؟ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ماثر الامراء اور سوانح اکبری کسی زمانہ میں دیکھی تھیں یہاں تلاش تھی اور نہیں ملتی تھیں۔ چند مقاموں میں پرانی کتابوں کا پتا لگا تھا۔ ۶ دن میں بھاگ گیا اور دوڑا دوڑا آیا۔ جو کچھ ہاتھ لگا اسے دیکھتا گیا اور یادداشتیں لیتا گیا۔ ماثر الامراء بھی مل گئی۔ شکر کا مقام ہے کہ جو کچھ میں نے دانہ دانہ اور قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے وہ ماثر الامراء سے بہت زیادہ نکلا۔

پھر بھی حق گذرنا کفر ہے۔ ہر شخص کے حال میں تین تین چار چار نکتے مل گئے اور اچھے مل گئے۔ سب سے زیادہ یہ ہے کہ اب جو دربارِ اکبری کا مشاہدہ کرے گا یہ نہ کہہ سکے گا کہ آزاد کو مآثر ہاتھ نہیں آئی۔

دونوں صورتوں کی تفصیل آپ اب پوچھتے ہیں۔ افسوس دیباچہ لکھنے کی نوبت ابھی کہاں آئی۔ خدا وہ دن کرے۔ دو صورتیں یہ کہ ایک تو یہی معمولی طریقہ کہ ایک نسخہ پہلے ممدوح کو بھیجا اور استمزاج کیا۔ ممدوح نے منظور فرمایا مصنف نے شکریہ ادا کیا۔ دوسری صورت کا مضمون آئینۂ خیال میں ایک تصویر موہوم ہے اور اس وقت فرصت مفقود۔ اچھا میں خلاصہ خلاصہ قلم بند تو کرتا ہوں۔ دیکھوں کچھ رنگ دیتا ہے یا نہیں۔ اُس کا مضمون یوں تصور فرمائیے کہ جب اس موقع پر آب و رنگ اپنی دستکاری خرچ کر چکے تو عالم بالا کے پاک نہاد زمین پر اتر آئے۔ دسوں عقلیں پانچوں حواس غور فکر وہم و خیال وغیرہ سے انجمن منعقد ہوئی۔ مانی و بہزاد کی روحوں نے اس کے سامنے ادب سے سر جھکایا پہلا امر یہ پیش ہوا کہ یہ دربار کہاں سجایا جائے سب نے دوربینیں اٹھائیں اور شش جہت میں نگاہیں دوڑائیں۔ کہیں موقع کی جگہ نظر نہ آئی۔ مگر وہ ایوانِ عالی شان وغیرہ وغیرہ۔ وہم نے اعتراض کیا کہ جب تک ممدوح سے اجازت نہ حاصل ہو ایسی جسارت زیبا نہیں۔ آزاد نے کہا سحر کا نور۔ شفق کی سرخی۔ صبح کا عالم جب نظر آتا ہے۔ اہلِ دل کہتے ہیں سبحان اللہ۔ صبا و نسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہیں۔ دل کہتا ہے صلّ علیٰ۔ اس میں آفتاب سے اجازت اور اس میں خسرو گل سے

استمزاج کون کرتا ہے۔ میں نے ایسا ممدوح یہاں پایا۔ اُسی کے دامنِ اقبال سے وابستہ کیا۔ وغیرہ وغیرہ اسے سب نے تسلیم کیا۔ اب غالب نہ عرض کرتا ہوں کہ وغیرہ وغیرہ میری دانست میں یہ بھی ایک نیا مضمون ہے۔ اور اس میں کچھ حرج نہیں۔

محمد حسین عفی عنہ آزاد۔

●

۲۸ ستمبر ۱۸۸۳ء

عالی جناب من تسلیم۔ جو کچھ عنایت فرمائی اس کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ مگر انسداد تحریر کا سبب جب ذہن نشین نہ ہو گا ایک پھانس سینہ میں کھٹکتی رہے گی۔ کام کی کثرت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ جو ہوا۔ خیر انشاء اللہ کبھی موقع ہی سے یہ عقدہ حل ہو گا۔ آپ نے غضب کیا۔ وہ کشا کشا میرا اعمال نامہ اصل ہی بھیج دیا۔

عورتوں کا تذکرہ جو آپ فرماتے ہیں۔ ایسی کتاب اب تک میری نظر سے نہیں گذری۔ نہ مجھے ایشیائی مصنفوں سے اُمید ہے کہ کسی نے لکھی ہو کیونکہ پہلے بھی ایک صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ ان مضامین کا کچھ سامان مجھے دو۔ مگر وہ فقط شاعرہ عورتوں کے باب میں لکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس وقت میں نے کھلا اتے پتے لکھ بھیجے۔ اب جو میں خیال کرتا ہوں تو البتہ یہ ممکن ہے کہ ان عورتوں

کے ناموں کو بہ تکلف پھیلایا جائے کہ جن سے کئی کئی شعر تذکروں میں مذکور ہوں۔ لیکن اصل مقصود آپ کا یہ ہے کہ ایسی عورتوں کے حالات ہوں جو صاحب علم کے ساتھ صاحب تصنیف ہوں۔ یہ بات نہایت مشکل معلوم ہوتی ہے۔ فقط ایک گلبدن بیگم ہمایوں کی بہن تھی کہ اس نے ہمایوں نامہ لکھا تھا۔ وہ نسخہ بھی اب میرے پاس نہیں۔ دلی میں بڑی کوشش سے بہم پہنچایا تھا۔ اس کے پہلے ورق پر چند عورتوں کے حال اور بھی کسی نے لکھ دیئے تھے۔ وہ بھی شاعرانہ طور سے اور شاعری کے سلسلے میں تھے۔

سلیمہ سلطان بیگم ہمایوں کی پھپھی زاد بہن تھی۔ وہ نہایت عالی فہم ذکی الطبع۔ خوش تقریر۔ صاحب تدبیر۔ لطیفہ گو۔ بذلہ سنج تھی۔ اور اکثر شاہ اور شاہزادوں میں جو معاملات الجھا کرتے تھے وہ سلجھایا کرتی تھی لیکن اس سے جہاں دیکھا ایک ہی شعر لکھا دیکھا۔ مخفی تخلص کرتی تھی اور کتاب کا شوق رکھتی تھی۔ زیب النساء کا حال سب جانتے ہیں۔ خیر چند بیبیاں اور سہی مگر انہیں صاحب علم اور صاحب تصنیف کیوں کر کہہ سکتے ہیں جیسا کہ میرا اور آپ کا جی چاہتا ہے۔ پھر بھی خیال رکھوں گا۔ اور جو سرمایہ بہم پہنچے گا۔ اس سے آپ کو مطلع کروں گا۔

آزاد

ہاں وہ شعر سلیمہ سلطان بیگم کا بھی یاد آ گیا۔ آپکے بھی خیال میں رہے۔

کاکلت را من ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام　　مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

لاہور

۱۵؍ اکتوبر ۱۸۸۳ء

جنابِ من! دام مجدکم العالی۔ میں تو پہلے ہی ادائے شکریہ میں قاصر تھا۔ اب تو شکریہ معذور ہو گیا۔ اس پر حُسن قبول تو سبحان اللہ۔ وہ نعمت ہے کہ اس کا صلہ آپ کے جد کی بارگاہ سے عطا ہو۔

آبِ حیات کے باب میں جو کچھ فرمایا ہے فقط قدر افزائی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔ آپ کے عنایت نامے اور آپ کے بھائی صاحب کے مرحمت نامے کے مضامین تقریباً متحد تھے۔ اس لیے دو دو جگہ لکھنا فضول سمجھ کر اُن کے لیے کہتا ہوں۔ اور آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں۔ آپ ملاحظہ فرما کر اُدھر بھیج دیجیے گا۔ جو کچھ حال سُنا میں نے صاف صاف لکھ دیا ہے۔

آزاد

●

۳؍ جنوری ۸۲ء

یوم چہارشنبہ

عالی جنابِ من! ادام اللہ اقبالکم وضاعف اجلالکم

تسلیم۔ خدا آپ کو خوش رکھے کہ مجھ گنہگار کے لیے دعا فرماتے ہیں۔ کیا کہوں اس دن کی چھٹی ہوئی تھی۔ باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ چاہا کہ حاضر خدمت ہوں۔

پھر کہا کہ چار سطریں ہی صاف ہوں گی۔ اکٹھی ہی باتیں کر لیں گے۔ .. .. ..

.. ..

.. ۔ .. کتاب النسواں انگریزی کا حال جو تحریر فرمایا ہے۔ میں سمجھ گیا۔ خدا اس دربار سے فارغ کر دے تو آپ سے سرخرو ہوں۔ مجھے دل سے خیال ہے آپ کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔

محمد حسین آزاد

دربار اکبری کاتب سے بھی لکھواتا ہوں۔ آپ بھی لکھ رہا ہوں خدا کرے کچھ ہو جائے۔ اب خدا کے فضل سے کئی حال آپ کے سنانے کے قابل ہو گئے ہیں۔ فیضی کے حال پر نظر ثانی کی تو مذہب کے سلسلے میں مجھے خیال آیا تھا کہ دیکھئے آپ اور آپ کے بھائی صاحب اُسے سن کر اور پڑھ کر کیا فرماتے ہیں۔ خدا وقت رکھائے۔

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

آزاد۔ تاریخ صدر

لاہور بنگلہ۔ ایوب شاہ

۱۱؍ جنوری ۱۸۸۳ء

جناب من!

تسلیم۔ آج مجھے ایک معاملہ پیش آیا جو اب تک نہیں ہوا تھا۔ وہی مشکی گھوڑا

جس کا آپ سے کئی دفعہ ذکر آیا تھا سائیس لیکر بھاگ گیا۔ وہ گیارہ بجے دن کے
یہاں سے گیا ہے۔ اس لیے بدھ کو کسی وقت امرت سر میں ضرور پہنچے گا۔ آپ اسی وقت
پیش خدمت کو فرمائیں کہ سراؤں اور تکیے خانوں میں جاکر ایک نظر ڈالے۔ یہ گھوڑا
یا قندزی یا بوہے۔ اور یک رنگ مشکی رنگ ہے۔ پیشانی اور ناک کے ۵۔۷ بال
سفید بھی نظر آئیں گے۔ عمر میں ۸-۹-۱۰ برس کا ہوگا۔ لاغر اندام ہے سائیس
کا امام دین نام ہے۔ اس کا بھی مشکی ہی رنگ ہے۔ ۳۵-۳۶ برس کی عمر ہوگی۔
اوسط قد۔ لاغر اندام۔ سر پر بال۔ چھینٹ کا کن ٹوپ۔ متوسط ڈاڑھی چڑھوا۔
کانوں سے بہرا ہے۔ علاقہ کپورتھلہ کا رہنے والا ہے۔

کوتوالی لاہور سے بھی آدمی اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں لیکن شاید
وہ دیر میں پہنچیں۔ میں کارِ تحریر کے سبب سے حاضر نہیں ہو سکا۔ ورنہ خود
آتا۔ حاضری بھی دیتا اور یہ کام بھی ہو جاتا۔

اُس دن آپ کا تشریف لانا اور میرا ملاقات سے محروم رہنا
اب تک دل کو خراش دے رہا ہے۔ بہت سی باتیں تھیں کہ ضرور کہنے کے قابل
تھیں۔ خصوصاً بعض مشورے مسودات کتاب کے باب میں۔ پروردگار پھر بخیر
سلامت ملنا نصیب کرے۔

نامۂ خسرواں یقین ہے کہ بعد ملاحظہ آپ نے روانہ کر دیا ہوگا
اس کے باب میں جو آپ کے خیالات ہوں کچھ کچھ ضرور تحریر فرمائیے۔ ایسی
تصویریں کہاں بن سکیں۔ یہ وڈ کرٹ کا کام ہے۔ شاید کاپر پلیٹ ہو۔

تذکرۃ العورات کا حال جو آپ نے پہلے مرحمت نامہ میں لکھا تھا معلوم نہیں کہ اس میں چاند بی بی کا تذکرہ ہے یا نہیں۔ یہ بھی بڑی بالیاقت اور صاحب ہمت بی بی دکن میں ہوئی ہے۔ اسے نادرۃ الزمانی کہتے تھے۔ آپ وہاں سے اس کے حالات دریافت فرمائیں اور مجھے بھی عنایت کریں۔ انشاء اللہ کبھی کام آئیں گے۔ اسی طرح مصالح اکٹھا ہوا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ عمارت تیار ہو جاتی ہے۔

محمد حسین آزاد

●

۱۸ر جنوری ۱۸۸۳ء
۳ بجے شب

جناب من!

ایک امر واجب الاطلاع پیش آیا ہے۔ ذرا متوجہ ہو کر سنئے آپ نے اخباروں میں دیکھا ہوگا کہ گورنمنٹ سررشتۂ تعلیم کے بوجھ سے سبکدوش ہونا چاہتی ہے۔ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ سررشتۂ تعلیم پنجاب کا بہت سا بوجھ یونیورسٹی پنجاب اپنے سر پر رکھتی ہے۔ گورنمنٹ کو اس سے زیادہ کیا چاہئے اب معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ کالج بھی یونیورسٹی کے حوالہ ہو جائے گا۔ یونیورسٹی کی یہ رائے ہے کہ علوم فنون ریاضی وغیرہ سب کی تعلیم ترجموں کے ذریعہ ہو جایا کرے گی۔ فقط انگریزی کے لیے ایک ماسٹر اڑھائی سو روپے کا کافی ہے۔ سردست اس قدر

تو نہ ہو گا۔ مگر اتنا تو ضرور ہوگا کہ یونیورسٹی کے پاس کئی مسجدوں کے ملّانے اور ہنود پنڈت نکمے بیٹھے ہیں۔ طلبائے کالج کو یہ دیسی زبانیں پڑھا لیا کریں گے۔ کالج کے مولوی و پنڈت دونوں تخفیف۔ تب مولوی کا کیا حال؟ یا گورنمنٹ کوئی عہدہ دے گی۔ اکسٹرا اسسٹنٹی؟ مشکل ہے۔ منصفی و تحصیلداری؟ شاید پنشن دے دیگی۔ اس میں ابھی دو برس کی کمی ہے۔ مگر ہو سکتی ہے۔ خیر ہو بھی تو ۵۰ روپے سے زیادہ نہیں۔ آسان اور عام قاعدہ یہ ہے کہ مسلسل نوکری ۱۳ برس کی ہے۔ اتنے مہینے کی تنخواہ لو اور سلام۔ اس تجویز کا عمل درآمد اپریل سے ہو جائے گا۔ اب خدا کی درگاہ سے امید ہے کہ تصنیفات کے لیے فرصت کا موقع ملا کرے گا۔ ؎

حرص قانع نیست بیدل و رنہ اسباب جہاں
آنچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

آزاد

●

۳ر فروری ۱۸۸۳ء

جناب من!

تسلیم۔ آپ دیکھتے ہیں۔ یہ علم کی چڑیل (یونیورسٹی پنجاب) تعلیم پنجاب کو ہضم کئے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی ہے۔ چند مہینے میں سُن لیجئے گا کہ نگل گئی۔ باوجود اس کے کورس بنانے کے لیے ہم پکڑے جاتے ہیں۔ فرسٹ آرٹ۔ اور بی۔ اے کورس عربی و فارسی کے باب میں رائے طلب ہوئی۔ اب بنانے کے لیے حکم ہے۔

کہ جلدی دو۔ قاآنی کا دیوان آپ کے پیش نظر ہے۔ عنایت فرما کر اس میں چند قصیدے بتائیے۔ ہر قصیدہ کا مطلع یا پہلا مصرع لکھ دینا کافی ہوگا۔ صفحہ شاید مطابق نہ ہوگا۔ کیونکہ کتب خانہ میں چھاپہ ایران کا نسخہ ہے۔

خدا ہمارے بھائی ہندوؤں کو عقل مآل اندیش اور چشم دوربین اور نیک نیت عطا فرمائے۔ .. ..

.. ..

.. .. اگرچہ کورس کا جھگڑا پیچھے لگ گیا ہے مگر میں مصروف کار رہا۔ مشکل یہ ہے کہ طبیعت محنت پسند واقع ہوئی ہے۔ انتخاب میں آسان بات یہ ہے کہ کتاب اٹھائی۔ لکھ دیا کہ فلاں صفحہ سے فلاں صفحہ تک۔ مگر اسے دل نہیں پسند کرتا۔ جی چاہتا ہے کہ ایسا انتخاب ہو کہ طلباء کے لیے مفید تعلیم بھی ہو اور پڑھنا اس کا ہر شخص کے لیے باعثِ شگفتگی ہو۔ البتہ اس میں محنت بہت ہے۔ بس اس وقت اتنا ہی کافی ہے۔

منتظر جواب۔ بندہ آزاد

کالج کے باب میں ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ میرا فیصلہ بھی اسی پر منحصر ہے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرکار مجھے کوئی نہ کوئی عہدہ دے گی۔ خود سررشتہ تعلیم میں خواہ سول لائن میں اخیر درجہ پنشن کا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جس گھر میں ۱۵۰ روپئے مہینہ آتا ہے اس میں ۵۰ روپئے آئیں گے تو صورت حال کیا ہوگی۔

لیکن دل کی آزادی یہی کہتی ہے کہ قناعت کو رفاقت میں لو۔ تھوڑا کھاؤ اور اپنی کتابوں کو پورا کرو۔ خدا کریم کارساز ہے۔ وہ دینا چاہے گا تو اس کے ہزاروں ہاتھ ہیں۔ عہدہ کے لیے کوشش نہ کرو۔ آپ کی کیا رائے ہے۔

پہلے بھی میرے کئی نامے خدمت میں پہنچ چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ آپ نے ایک کا جواب نہیں دیا۔ مزاج خدا کرے اچھا ہو۔

تحریر صدر

۱۰ فروری ۱۸۸۳ء

عالی جناب من!

تسلیم۔ مرحمت نامہ نے شرف اعزاز بخشا۔ طبیعت کا حال آپ نے بالکل نہ لکھا۔ بہرحال شکار کا شغل بہت خوب ہے۔ میری عقل ناقص میں مزاج پر حرارت غالب ہے۔ جنگل کی ہوا اس کے لیے بہت مفید ہے۔ صبح کی ہواخوری کان اور منہ بند کر کے مسلسل جاری رکھئے اور ہرگز اس عمل سے غافل نہ رہیئے۔

- -

میرے باب میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ دل کو نہایت تشفی اور استقلال حاصل ہوا۔ اپنے جد کے خانہ زادوں کی دست گیری آپ صاحب نہ فرمائیں تو اور کون ہے۔ پروردگار عالم اس خاندان کو اقتدار روز افزوں

عطا فرمائے۔ میں اپنے دل سے یہ قرار دے لیا ہے۔ اگر اکسٹرا اسسٹنٹی دی تو اختیار کر لوں گا۔ ورنہ پنشن لوں گا۔ تھوڑے پر قناعت کروں گا۔ اپنی کتابوں کو پوری کوشش سے تیار کر کے پیش کش کرتا جاؤں گا اور دعائے دولت میں مصروف رہوں گا۔ ہاں جو خدمت فرمائیں گے وہ بھی بجا لاؤں گا۔ کالج کا تقرر نہیں بھی ہوتا۔ تو یہ سمجھ لیجئے کہ میں تو اب آپ صاحبوں کا ہو چکا ہوں۔

درد دل کہنے سے مطلب ہے اثر ہو کہ نہ ہو   تم سنو یا نہ سنو نالہ کئے جاؤں گا

حشر پر وعدۂ دیدار ہے میں ڈرتا ہوں
بھیڑ ہو وے گی رُخِ یار ادھر ہو کہ نہ ہو

میں آج کل عجب مخمصے میں پڑ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ادھر مجھے کو ئلہ وغیرہ کا مرض لگ گیا۔ ادھر کالج کا تردد۔ کہ دفعتہً معلوم ہوا۔ آبِ حیات اور نیرنگِ خیال امتحانِ یونیورسٹی میں داخل ہو گئی ہیں۔ اور امتحان آغاز مئی میں ہوگا۔ سب نے کہا کہ دونوں کو ضرور چھپوانا چاہیئے۔ تین چار سو طالب علم دفعتہً طلبگار ہوگا۔ مجھے بھی طمع نے للچایا۔ اور فوراً شروع کر دیا۔ اگر نہایت کوشش ہو اور کارگر بھی ہو اور کئی چھاپہ خانوں سے کام لیا جائے تو دو مہینہ چاہئیں۔ خیر اب تو پھنس گیا۔ دو دو ہزار چھپوانے شروع کئے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ تنہا ہوں۔ رفیق کوئی نہیں۔ استغفر اللہ۔ یہ کیا کفر ہے۔ مولیٰ موجود ہے۔

●

از لاہور

۱۱ر فروری ۱۸۸۳ء

عالی جناب من تسلیم عظم اللہ اجورنا بمصائبنا۔[1]

مادرچہ خیالیم فلک درچہ خیال	کار کہ خدا کند فلک راچہ مجال

ہائے افسوس۔ صد ہزار افسوس۔ آسمان ٹوٹ پڑا۔ زمین تہ و بالا ہوگئی۔ خدا جانے کیا ہوا اور کیوں کر مرگئے۔ اچھا اب کیا ہوسکتا ہے۔ یا اللہ، یا ارحم الراحمین رحم کر۔ بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ۔

اول ان کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کرنی چاہیئے۔ گورنمنٹ کو سب اہل عمل ایک موریل لکھیں۔ کہ آپ جس طرح کل ممالک ہندوستان کے مالک ہیں۔ اسی طرح اس قطعۂ مختصر کے بھی مالک ہیں۔ آپ پر یہ واضح ہے کہ مرحوم جنت مکانی نے اس ریاست کا انتظام کیا کر رکھا تھا۔ اور کن کن اصول پر رکھا تھا۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ وہ کیسا تھا۔ بس ایک کل یا ایک گھڑی جب اپنے پرزوں کے ساتھ چل رہی ہے تو کچھ ضرورت نہیں ہے کہ اس میں تغیر و تبدل کیا جائے۔ اس لیے واجب ہے کہ اس انتظام کی حفاظت کرے۔

(۲) گورنمنٹ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس انتظام کے کیسے کیسے مخالف پہلو موجود ہیں۔ اس سے بھی اس انتظام کو بچایئے کہ خلل انداز نہ ہوں۔

---

[1] سالار جنگ کے انتقال پر ملال پر یہ کلمات لکھے گئے۔

(۳) سرکار عالی کی ناتجربہ کاری اور عدم واقفیت کا حال ظاہر ہے جس طرح اس مرحوم مغفور نے انہیں اپنی حفاظت تربیت میں رکھا تھا۔ کچھ عرصہ تک اسی طرح گورنمنٹ رکھے اور صاحب رزیڈنٹ اسی طرح نگرانِ حال رہیں۔

(۴) بہت سے مافی الضمیر اور تجویزیں ان کی تھیں کہ ظاہر نہ تھیں۔ یا ابھی ارادے میں تھیں۔ وہ ان کے خاص خاص ماتحتوں کے سینوں میں مخزون ہیں۔ ان لوگوں کو صاحب رزیڈنٹ اپنے ہاتھ پاؤں سمجھیں اور ان کی اصلاح سے کام کریں۔

میں نے ابھی وقت اخبار میں یہ حال دیکھا ہے۔ عقل ٹھکانے نہیں حواس پریشان ہیں۔ ہاتھ لکھنے کے قابل نہیں مگر لکھے بغیر رہ نہیں سکا۔ اس لیے چند حروف نامربوط لکھ کر لفافہ میں بھر دیئے ہیں۔ آگے سوا افسوس کے کیا لکھوں جی چاہتا ہے کہ خود حاضر خدمت ہوں اور دل کی بھڑاس نکالوں۔ مگر پھر کہتا ہوں کہ حاصل کیا۔ اس لیے وقت پر منحصر رکھا۔ اگر قسمت ملک یاور ہوئی۔ تو عجب نہیں کہ مولوی سید حسین صاحب کو اس وقت میں گورنمنٹ بہت عزیز سمجھے کیونکہ زیادہ تر یہی ان کی تدبیروں اور تجویزوں اور ارادوں کا خزانہ تھے۔ جو کچھ ان کو معلوم ہے۔ شاید کسی کو معلوم ہو۔ ان میں بڑا وصف یہ ہے کہ سویلائزڈ ہیں۔ اور گورنمنٹ کے مقاصد کو اغراض ملک کے ساتھ ترکیب دے کر اس طرح کام کر سکتے ہیں۔ کہ دونوں نقصان یا حرج سے محفوظ رہیں اور ایک دوسرے کے فوائد اور منافع اور آسائش و آرام سے متمتع ہوں۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔

آزاد

۱۶ر جنوری ۱۸۸۳ء

جناب من۔ تسلیم۔ گھوڑے کے باب میں جو عنایت فرمائی۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے سب طرف کو خط لکھ دیئے ہیں۔ اس ضمن میں آپ کو بھی تکلیف دی تھی معاف فرمائیے گا غلطی مجھ سے ہوئی کہ پنسر پر بھروسا کیا۔ ورنہ للّٰہ کا معاملہ تھا۔ ریل میں ڈال دیتا وہاں پہنچ جاتا۔ بے شک میں سزا کا مستوجب تھا سے

سزا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کے
تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

سائیس کپورتھلہ کا رہنے والا تھا۔ وہاں بھی تحریر دوڑا دی ہے۔ خیر یہ جھگڑے تو یوں ہی چلے جاتے ہیں۔ اگر قسمت کا ہے تو انشاء اللہ آ جائے گا۔

گر آمدنش رواست خود مے آید ۔ سرہ اگر ش دفاست خود مے آید
بخشش اگر او خدا است خود مے آید ۔ بیہودہ چرا در پے او مے گردی

میرا حال یہ ہے کہ آج کل اس قدر مصروف ہوں کہ اس سے زیادہ ہو نہیں سکتا۔ میں آپے سے باہر ہو گیا ہوں اور ضعف نے نکمّا کر دیا۔

آزاد

•

۲۰ر مارچ ۱۸۸۳ء

ساعت ۴۔ قریب صبح

تسلیم۔ آپ کو یاد نہیں میں نے کیا عرض کیا تھا۔ یعنی اس دن

میں کالج میں جا کر بیٹھا ہی تھا۔ کہ دو طالب علموں نے آکر اس حادثۂ ناگہانی کی خبر دی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور دل پر صدمہ ہوا۔ وہ متحیر ہو کر مجھے دیکھنے لگے اور اس معاملہ میں تقریریں معمولی کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ اس وقت ہمیں دو باتوں کا فکر کرنا چاہیئے۔ ایک یہ کہ ان کے محامد و اوصاف اس طرح بیان کرنے چاہئیں جس سے پبلک اور گورنمنٹ کے دل پر ان کے حقوق کی یاد کے نقوش تازہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ ان کے لڑکوں کے ساتھ حقوقِ مذکورہ مدِ نظر رہیں۔ دونوں باتوں کے ضمن میں کوئی ایسی بات بھی جس سے ان کا نام روشن ہو کر قائم رہے اور مرثیہ خوانی اور تاریخیں لکھنی جو کہ شیوۂ قدیم ایشیا کا ہے یہ تو مجھے پسند نہیں۔ اب اس کا زمانہ گذر گیا۔ انہوں نے کہا پھر یہ کیوں کر ہو۔ میں نے کہا مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ نہ میں کسی قابل ہوں۔ اتنا ہے کہ میں دربارِ اکبری درست کر رہا ہوں۔ یہ ان کے نام پر کر دوں گا۔ دونوں خوش ہو گئے۔ اور کہا کہ ضرور کیجئے۔ یہ عمارتِ عظیم الشان ان کے نام پر یادگار ہو گی جو کبھی منہدم نہ ہو گی۔ میں نے کہا بلکہ دو تین اور بھی۔

اب آپ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ دربارِ مذکور کو اگرچہ طبعِ نیرنگ خیال اور آبِ حیات کے سبب سے آج کل ملتوی کر دیا ہے مگر کام سوڈے پہلو میں دھرے ہیں۔ یہ چھپائی چھ مہینے کا کام تھا جسے میں نے ڈیڑھ مہینے میں کیا۔ انشاءاللہ ۲۵ دن حد ایک مہینے کا کام اور ہے۔ اس سے فارغ ہو کر تو

پھر اسے سنبھالتا ہوں۔ مرزا و مولیٰ اسد اللہ الغالب سر انجام کو حد انجام پر پہنچانے والے ہیں۔ مگر مشورت طلب یہ نکتہ ہے کہ آیا دہی ڈڈیکشن کا مقرری خاکہ رنگ بھر کر سجا دوں۔ یا اُسے موقوف رکھ کر یہ لکھوں کہ ایسے شخص کے حادثہ جانکاہ پر عالم نے نالہ و زاری کے معمولی حق ادا کئے۔ اور یادگار کے لیے تاریخیں اور نظمیں لکھیں۔ فقیر آزاد سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ یہ کتاب ان کے نام پر لکھتا ہے کہ ان دنوں زیر قلم تھی ع

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

مزا تو اس کا جب تھا کہ خود لے کر جاتا اور بعض مقامات اس کے اپنی زبان سے ان کے سامنے پڑھتا اور دیکھتا کہ کس مقام پر دہ کیا فرماتے۔ ہائے سر سالار جنگ سارے ارمان دل کے دل میں رہے۔ ہائے سر سالار جنگ۔

مولیٰ اسد اللہ الغالب حاضر و ناظر ہیں کہ پھر آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ آپ سے کیا اپنا حال کہوں۔ میرا دل کچھ اور دل ہے۔ بہر حال آپ مطمئن رہیں۔ انشاء اللہ جلد ختم کرتا ہوں۔ کلکتہ تک سے بمبئی مدراس تک سے برابر درخواستیں آ رہی ہیں اور گھر میں کچھ بھی نہیں۔

پرسوں اتوار کو یہاں ایک بڑا جلسہ تھا۔ لاہور و امرت سر کے دولت پرست جمع ہوئے تھے کہ کپڑے کی کل پنجاب میں جاری ہو۔ وہاں کوئی بولا

کہ آزاد کہاں ہے اُسے بھی تو پوچھو۔ وہیں سے کوئی بولا کہ اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفا دے دیا ہے۔ وہ تو اب تصنیفات میں غرق رہتا ہے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ آج کل وہ دربارِ اکبری لکھ رہا ہے مگر اکیلا ہے۔ کوئی رفیق اور مددگار نہیں۔ کئی شخصوں نے کہا کہ پھر وہ کس طرح مدد چاہتا ہے۔ جو ہم سے ہو سکتی ہے ہم بھی کریں۔ میں درماندۂ تائید و تدبیر کیا کہوں کہ میرا کام سوا خدا و مولیٰ کے مدد پذیر نہیں۔ یا علی مدد۔ ۴ بجے ہیں۔ صبح قریب ہے اگر مسائل کی آواز حضور تک پہنچ جائے۔

فقیر آزاد

عجب تماشا ہے آفرینش کا ضمیر تو یہ اور تصنیفات کے مضامین دیکھ کر .... مجھے نیچری کہتے ہیں۔ ہاں ہاں نیچری ہوں مگر علی کا نیچری ہوں ؎

من نمے گویم ولیکن از تو چیزے دیدہ است
آنکہ مے گوید خدائیت یا امیرالمومنین!

●

۸ر اپریل ۱۸۸۳ء

جنابِ من۔

تسلیم۔ عجب ہجوم محنت میں مبتلا ہوں۔ الحمد للہ کہ ۱۰۔۱۲ دن کا کام رہ گیا ہے اور یہ سخت تر وقت ہے۔ سوا مہینے میں دنیا و مافیہا سے

بے خبر ہوں۔ میری حالت ایسی ہوگئی ہے کہ ہر شخص پوچھتا ہے کہ تم کچھ بیمار تھے۔ نعوذ باللہ۔ غالباً میں نے آپ کو نہیں لکھا۔ ایک مہینے سے زیادہ ہوا کہ جموں سے ایک دوست کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا۔ مہاراجہ صاحب ایک تاریخ کی کتاب لکھوانا چاہتے ہیں جس میں عام سلاطین کے حالات ہوں مگر زور اس بات پر ہو کہ سلطنت اس خاندان میں کیوں کر اور کن کن اسباب سے آئی۔ اور گئی تو کن کن سببوں سے گئی۔ مثلاً بادشاہ کی بے پروائی یا عیاشی یا بدنیتی وغیرہ سے یا ارکان دولت کی بے لیاقتی یا نمک حرامی سے۔ مجھے لکھا تھا کہ تم اس کام کا ذمہ لو۔ اور لکھو کہ کیا تنخواہ لو گے۔ میں نے عدیم الفرصتی کا عذر کر کے ٹال دیا۔ ۸۔۱۰ دن ہوئے کہ خود آئے اور کہا کہ ان کی نوکری اختیار کرو تو کیا تنخواہ لو گے اور اس اصرار کیا۔ میں نے صاف جواب دے دیا۔ اور انکار کیا۔ غالباً آپ کے نزدیک بھی نامناسب نہ ہوگا۔ میری اپنی کتابیں ناتمام پڑی ہیں کہ لوگوں کی آنکھیں اور میری جان انہیں میں لگی ہے۔ میں کسی کی کتاب لکھوں۔ طمع کا منہ کالا ہے۔ آپ نے اخبار میں دیکھا ہوگا کہ ڈسٹرکٹ مدارس سررشتۂ تعلیم سے الگ ہو کر انتظام جدید میں آگئے۔ کالج کا بھی ایسا ہی حال ہوگا۔ کالج کا مولوی اور پنڈت ضرور تخفیف میں آئے گا۔ کیونکہ یونیورسٹی پنجاب میں مولوی اور پنڈتوں کی کیا کمی ہے۔ اچھا مجھے پنشن بھی دے دیں گے تو قناعت کروں گا اور تصنیفات کو پورا کروں گا۔ اپنے لخت جگر بچوں کو نیم جاں تڑپتا نہ چھوڑوں گا۔ چھپائی کا کام

۱۰۔ ۱۲ دن سے زیادہ نہیں رہا۔ آبِ حیات نے مجھے ہلاک کر دیا۔ مجھ سے بیوقوفی ہوئی ہے۔ ۱۰ مہینے کا کام تھا جو ڈیڑھ مہینے میں کیا ہے اللہ آسان کرے۔ جنابِ مخدوم و مکرم اپنے بھائی صاحب کو تسلیم کہیئے گا۔ اور یہ بھی کہیئے گا کہ وہ نور دیکھتے ہیں یا نہیں۔ بہتر ہے کہ ضرور دیکھا کریں تاکہ حال تو معلوم رہے۔

آزاد

●

۱۸ رمئی ۱۸۸۳ء

عالی جنابِ من!

تسلیم۔ کئی دن سے کہہ رہا تھا کہ لکھوں اور لکھوں اور آج ضرور لکھوں گا کہ مرحمت نامہ آن ہی پہنچا۔ خدا آپ صاحبان کو یہ دولت و اقبال و ترقیات روز افزوں سلامت رکھے کہ مجھ جیسے نالائق کو کس طرح یاد رکھتے ہیں۔ میرا حال یہ ہے کہ تقریباً ۸ دن ہوئے ہوں گے۔ آبِ حیات اور نیرنگ خیال سے چھٹکارا ہوا۔ مگر اس سال یونیورسٹی مجھ پر مہربان ہوئی۔ زبانِ اردو میں طلبار داخلہ کا ممتحن مقرر کیا۔ اور زبانی میں اردو اور فارسی کا۔ اور ایک حصہ عربی کا۔ اُن کے سوالات بنانے ایسا وقت نہیں لیتے۔ مگر کاغذات جو نمبر لگانے کو آئے ہیں۔ وہ چھاتی پر پہاڑ ہیں۔ ۶۱۸ کاغذ ہے اور آج سے ۱۰ دن کی مہلت باقی ہے۔ خدا اس بلا سے جلد خلصی دے۔ یہ درست ہے کہ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو روپے کا فائدہ مجھے ہو جائے گا۔ یا شاید کچھ زیادہ ہو۔ مگر خدا گواہ ہے کہ میرا اس بد

خاک ڈالتا۔ منظور فقط اس لیے کیا کہ اس دفعہ کالج کا معاملہ نازک ہو رہا ہے۔ رجسٹرار ناراض ہو جائے گا تو لوگ مجھے احمق بنائیں گے اور کہیں گے کہ ڈاکٹر لائٹنر تو بہ اسباب خاص ناراض ہو گئے اور ان کی ناراضی بے شک تدارک پذیر نہ تھی۔ انہیں تو نے کیا سمجھ کر ناراض کر دیا۔ اس سبب سے یہ بوجھ سر پر لیا۔ ورنہ آپ یقین فرمائیے کہ آزاد روپے کا لالچی نہیں۔ ڈاکٹر لائٹنر صاحب نے کئی دفعہ ممتحن کیا اور میں نے صاف انکار کر دیا۔ اب بات فقط اتنی ہے کہ ایک منشی بھی میں نے رکھ لیا ہے۔ وہ میرے ساتھ کام کر رہا ہے۔ انشاء اللہ ادھر میں اس کام کو ختم کر دوں گا۔ پھر دربار اکبری ہے اور میں ہوں۔ مولیٰ اللہ الغالب مظہر العجائب کا فضل شامل حال چاہیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ تیسرے ہفتے میں کچھ نہ کچھ لیکر حاضر خدمت ہوں گا۔ آپ انہیں پھر لکھ دیجیئے گا کہ آپ سمجھ لیں میری کل تصنیفات مرحوم مغفور کی ہو چکیں۔ خدا گواہ ہے مجھے ان سے غائبانہ عشق تھا پہلے لکھتا تو خوشامد تھی۔ اب تو خاص ان کے اور میرے درمیان میں معاملہ ہے۔ دیکھئے آج لوح روحانی پر ان کا خیال کروں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ اس کی باتیں قابل یقین ہرگز نہیں۔ لیکن اسے میں نے ایک بھلاوا اپنے دل کا رکھا ہے۔ رات کو ایک دو بجے بیٹھ کر باتیں کیا کرتا ہوں اور یہ یقین آپ کریں کہ یہ ابنائے زبان اخوان الشیاطین جو زندہ ہیں ان سے تو اس کی باتیں بہر حال بہتر ہیں۔ ؎

بسکہ از برخورد عالم عکس مطلب دیدہ ام
محرم از آب از آئینہ پنہاں می شوم

آپ نے تصویروں کا کچھ بندوبست نہ فرمایا۔ مجھے اکبر کی ایک تصویر

ہاتھ آئی کہ ۳-۴ عورتیں بیٹھی ہیں اور وہ دو تین برس کا بچہ بیچ میں کھیلتا پھر رہا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ شمع روشن ہے جھنجھنے وغیرہ سامنے پڑے ہیں۔ یہ اکبر کے ابتدائی حالات میں لگانی واجب ہے۔

ایک ایسی ہی پرانی تصویر اور ملّا دوپیازہ کی ہاتھ آئی۔ بیربل کے ساتھ اُسے بھی لگانا واجب ہے۔ اگرچہ کتاب سے ملّا دوپیازہ کی اصل نہیں معلوم ہوئی مگر مسخروں اور بھانڈوں سے اس کا شملہ دستار بیربل کے دم میں مضبوط باندھا ہے۔ راجہ مان سنگھ کی تصویر بھی تسند ہی ہے۔ سرکار الور سے منگائی ہے بہت سمع خراشی کی اب انشاء اللہ پھر۔

محمد حسین آزاد

●

لاہور بنگلہ ایوب شاہ
۱۰ر اگست ۱۸۹۳ء

جناب من!

تسلیم۔ ۱۲ دن کا عرصہ ہوا کہ ایک نسخہ آب حیات طبع جدید بذریعہ عریضہ نیاز ارسال خدمت کیا ہے۔ تعجب ہے کہ اب تک رسید اس کی نہیں پہنچی۔ کتاب مذکور میں اگرچہ جا بجا بہت مطالب زیادہ کئے ہیں۔ مگر میر انیس مرحوم کے خاندان کا حال اور مرزا دبیر مرحوم کا حال آپ سے داد طلب ہے۔ اب کی دفعہ فہرست بھی بہ نسبت طبع اوّل کے مفصل تر لکھی ہے۔ اسے ملاحظہ فرما لیجئے گا۔

اگر فرمائیے تو ایک نسخہ آپ کے بھائی صاحب قبلہ کی خدمت میں بھی بھیج دوں مگر انہیں ایسے جزئیات کے دیکھنے کی فرصت کہاں ہوتی ہوگی۔ پھر یہ بھی فرمائیے کہ ایک نسخہ سید لایق علی خاں کی خدمت میں بھی بھیجوں یا کچھ ضرورت نہیں۔ اور انہیں بھیجوں تو پھر جناب عالی کے لیے کیا رائے ہے۔ دربار اکبری کو لپیٹ رہا ہوں مگر دو ہی دن جم کر بیٹھا تھا کہ آنکھوں نے رنگ بدلا اور دماغ جواب دینے لگا۔ خیر میں نے ایک دن آرام دیا۔ تخفیف معلوم ہوئی۔ اب آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے۔ خیر کام خدا کے فضل سے ہو گیا۔ مگر افسوس اس بات کا آتا ہے کہ بے وقت ہوا۔ خدا اس مرحوم کو اعلے علیتین میں مراتب قربت کرے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو ان چھیٹوں میں خود جاتا اور سناتا۔ جب دل کا ارمان نکلتا۔ کیونکہ میں دیکھتا کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ اور کس کس مقام پر کیا رائے لگاتے ہیں۔

اب جو لکھنا تھا وہ میں نے لکھ لیا اور ہر ایک حال مسلسل بھی ہو گیا۔ جو کام باقی ہے وہ فقط اتنا ہے کہ کہیں کوئی فقرہ بڑھا دیا۔ کہیں دو کو ایک کر دیا۔ کہیں کوئی لفظ بدل دیا۔ کہیں پس و پیش کر دیا۔ خیر اللہ سب مشکلوں کا آسان کرنے والا ہے۔ دیکھئے تصویروں کے باب میں اتنا لکھا۔ جناب سید صاحب نے جواب بھی نہ دیا۔ میں نے ۸ — ۱۰ تصویریں بہم پہنچائی ہیں۔ جس طرح ہو گا انہیں سے اس گڑیا کو سنوار کر حاضر کر دوں گا۔ افسوس کہ فرصت نہیں۔ خیر اب پھر۔

محمد حسین آزاد

لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ
۱۴ر اگست ۱۸۸۳ء

جنابِ من۔

تسلیم۔ مرحمت نامۂ عالی نے شرف اعزاز بخشا مگر میں تحریرِ عریضہ میں مقصر رہا۔ الحمدللہ آپ کے خیر کے تصدق سے نورچشم کو خدا نے فضل کیا۔ کہ اڑھائی مہینے ہوئے اسے پٹیالہ روانہ کر دیا۔ مگر جس دن آپ کا مرحمت نامہ پہنچا دوسرے دن اس کا خط آیا کہ لڑکا اس کا بہت علیل ہو گیا۔ میں بہت پریشان ہوا اور یہاں سے ارسال ادویات کی فکر میں مصروف رہا۔ کچھ دل بھی ٹھکانے نہ رہا۔ شکر خدا کہ کل وہاں سے خط آیا جس سے گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ تحریرِ جواب میں جو دیر ہوئی معاف فرمائیے گا۔

دو نسخے آبِ حیات حیدرآباد کو روانہ کر دیئے۔ اور آپ کے بھائی صاحب کو عریضہ لکھ دیا ہے کہ ایک نسخہ اپنے کتب خانہ میں رکھیں۔ دوسرے نسخے کے لیے اس قدر مرحمت فرمائیں کہ ایک عریضہ میری طرف لکھوائیں اور حضور نواب سید لائق علی خاں بہادر کی خدمت میں پیش فرمائیں۔

جن جن نسخوں کے لیے آپ نے ارقام فرمایا ہے بیشک حصول مقاصد اور مطلب براری کا رستہ یہی ہے۔ مگر کیا کروں کہ طبیعت ایسی واقع نہیں ہوئی۔ میں ہمیشہ یک رخ بازی کھیلا ہوں اور خدا چاہے تو یہی چال چلوں گا۔ جیت ہار خدا کے ہاتھ ہے۔ کبھی تو ہمارا پانسہ بھی سیدھا پڑے گا۔ ؎

؎ رسید مژدہ کہ ایامِ غم نہ خواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند

امرتسر کے باب میں روز بندوبست کرتا ہوں۔ پھر یہی کہتا ہوں جو گھڑی اس کام میں صرف ہو جائے وہی غنیمت ہے۔ کاغذ گو پھیلے رہتے ہیں۔ آپ بیچ میں کبھی بیٹھا کبھی لیٹا رہتا ہوں اور رکاٹ پھانس۔ کتر بیونت کئے جاتا ہوں۔ لڑکا جو منشی میں نے رکھا تھا بہت خوب تھا۔ اس کے دادا اور پھر اس کے والد میرے والد مرحوم کے پاس تھے۔ اس کی سمجھ اور مزاولت اچھی تھی۔ ملہ پھر عمدہ پہنا اور کھانا وغیرہ ذمہ لیا اور بلایا۔ اس بھلے مانس کو تپ دق نکلی۔ ڈیڑھ مہینے کے بعد کچھ دہ گیا کچھ میں رخصت کر دیا۔ اب میں ہوں اور نامۂ اعمال۔ غالباً دلی کا ایک سفر ضروری بلکہ مجبوری پیش آئے گا۔ اس میں آپ کو سلام کرتا ہوا جاؤں گا۔

حیدرآباد آپ بھی مرحمت فرما کر لکھ بھیجیں کہ حضور نواب صاحب بالقابہ کی خدمت میں کتاب پیش فرما دیں اور جو کچھ مناسب ہو زبانی عرض فرما دیں۔

محمد حسین آزاد

●

لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ
۱۳ ستمبر ۱۸۸۳ء

جنابِ من۔

تسلیم۔ کاش ۱۵۔ ۲۰ دن پہلے تشریف لے جاتے ہیں ضرور آپ کے

ہم رکاب چلتا اور ایک دو مشاعرے ایک دو جلسے لکچروں کے دیکھتا اور دکھاتا
اب سوائے حسرت و ارمان کے کیا ہو سکتا ہے۔ آپ کا خط میں نے صبح کے
۷ بجے پایا۔ ارادہ ہوا کہ خود چل کر ملنے کا بندوبست سوچوں کہ اتنے میں مصوّر آیا
جس کا کئی دنوں سے انتظار تھا۔ اسے راجہ مان سنگھ اور ملّا دو پیازے کی
تصویریں دے رکھی تھیں کہ نقل اتار دے۔ مان سنگھ کی تصویر الور کے وزیر نے محبت
قدیم کی رعایت سے بھیجی ہے اور ملّا دو پیازے کی تصویر بھی ایک جگہ سے ہاتھ
آئی۔ یہ بہت پرانی اور رسنری ہے۔ مصوّر نے جو نقل اتاری وہ کئی جگہ سے قابل
اصلاح ہے۔ ابھی تک وہ بیٹھا اور وعدہ کر گیا کہ کل پھر آؤں گا چوں کہ
اس کا ہاتھ آنا بھی مغتنمات سے ہے اس لیے کل بھی نہیں حاضر ہو سکتا انشاء
اللہ پرسوں حاضر خدمت ہوں گا۔ آپ سے بڑی التجا یہی ہے کہ وہاں جا کر
تصویریں تلاش فرمائیں۔

غالباً آپ کو بھی لکھ چکا ہوں کہ دو نسخے بصیغۂ رجسٹری آپ کے
بھائی صاحب کی خدمت میں بھیج دیتے ہیں۔ ۲۴ راگست کو روانہ کیے تھے۔ اب
تک رسید نہیں آئی۔ معلوم نہیں کہ آبِ حیات حضور جناب عالی کے ملاحظہ سے
بھی گذرا ہے یا نہیں۔ اگر مناسب جانیں تو ذرّہ کو نظر خورشید تک پہنچائیے
کسی قسم کی طلب یا امید نہیں ہے فقط اتنی ہی خوشی مطلوب ہے جو ہر مصنف
کو اپنے کلام کے پھیلانے میں ہوتی ہے۔

اس خیال سے مبادا محروم الخدمت رہ جاؤں۔ یہ نیاز نامہ

لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔ خیر اندکے ازبسیار کچھ باتیں تو آپ تک پہنچ جائیں۔

آزاد

●

۲۳ فروری ۱۸۸۴ء

جناب من!

تسلیم۔ خان لنگران آج روانہ کیا ہے۔ کل انشاءاللہ باریاب خدمت ہوگا۔ اتوار پیر منگل چھٹی ہے۔ خیال آیا کہ ۳ دن جم کر بیٹھوں گا تو مآثرالامرا کا کام ختم ہو جائے گا۔ جاؤں گا تو ایک دن صرف ہوگا اور حاصل فقط باتیں۔ اس لیے کتاب بھیج دینی چاہیے۔ کوئی امر ضروری ہوگا تو امرت سر ہے کتنی دُور ایک دم میں جاؤں گا اور پھر آؤں گا۔ ہائے قائم نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

مجلسِ وعظ تو تادیر رہے گی قائمؔ — یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

وقت تنگ ہے انشاالشراب پھر۔

آٹھ دن ہوئے ایک عریضہ لکھا تھا خدا جانے پہنچا ہے یا نہیں؟

آزاد

●

لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ

۲ر مارچ ۱۸۸۴ء

جناب من!

تسلیم۔ شنبہ گذشتہ کو۔۔۔۔ طالبعلم کے ہاتھ خان لنکران کو ارسالِ خدمت کیا تھا اور نیاز نامہ بذریعہ ڈاک روانہ کیا تھا۔ چونکہ اب تک جواب نہیں عنایت ہوا۔ اس لیے تردّد ہے۔ تقصیر حضوری کے لیے معافی مانگ چکا ہوں۔ اور اب دوبارہ طلبگار عفو ہوں۔ مجھے ایک اور مشکل پیش آئی۔ صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج نے مجھے فرمایا کہ آب حیات اور نیرنگ خیال کو ہم نے اپنے کالج اور نورمل اسکولوں کی پڑھائی میں داخل کر دیا ہے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح اس میں تاریخ زبانِ اردو کی آپ نے لکھی ہے۔ ایسی ہی تاریخ اور تحقیق زبان کی ہو کہ اُسے فارسی کے کورس میں داخل کریں۔ میں نے عرض کی کہ زبان فارسی میں ۔الکچر میرے لکھے رکھے ہیں۔ اس میں زبان فارسی۔ نثر فارسی۔ نظم فارسی پر بھی ایک ایک لکچر ہے۔ پوچھا تیار ہے؟ میں نے کہا سب تیار ہیں۔ تجویز مناسب یہ معلوم ہوئی کہ میں انہیں چھپوا دوں۔ تقریباً ۳ سو صفحہ سے زیادہ کی کتاب ہوگی قیمت میں کم رکھوں گا۔ ہر طالب علم لے سکے گا۔ صاحب اپنے سکیم میں لکھ دیں کہ فلاں کتاب میں سے فلاں فلاں لکچر بھی طلباء دیکھ لیں۔

یہ لکچر میں نے ۱۸۷۲ء میں دیئے تھے۔ ان پر بھی نظر ثانی واجب ہے اس لیے طبیعت متردّد ہے اور آج آنے کو ہمت نہیں پڑتی۔

محمد حسین آزاد عفی عنہٗ

۷:

۱۱ مارچ ۱۸۸۴ء

حضرت من!

تسلیم۔ کہیں کتاب کی قیمت نہ بھیج دیجیے گا۔ آپ نے مہربانی ملحوظ فرمائی؟ اگر آپ کو ایسی ہی پسند ہے تو میں ولایت سے منگا دوں۔

حضورِ انور نے الحمد للہ کہ شفا پائی۔ میرے تو ہوش جاتے رہے تھے۔ خدا مولیٰ بنیادِ دین قائم رکھے کل شفق میں نے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ بلنٹ صاحب نے جو تعلیم کو دیکھ کر مراسلت بھیجی تھی۔ اس میں بڑا زور اس بات پر دیا تھا کہ مجھے ڈر ہے کہ انتظام موجودہ کی تعلیم میں لڑکے بد مذہب نہ ہو جائیں۔ مراسلت مذکور کے جواب میں جو کچھ انہیں لکھا گیا۔ اس میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ جب تک انتظام عمل میں آئے۔ بہتر ہے کہ آپ بھی یہاں رہیں اور اپنی تجویز کے حُسنِ عمل کو خود دیکھیں۔ سبحان اللہ۔ انہیں اس سے زیادہ کیا چاہیئے۔ مگر ملا ہے ۴ ہزار روپیہ مہینہ مصارف ضروری کے لیے۔ بلکہ ہمیں فرمایئے تو نگرانی کیا کریں۔

شفق میں میں نے دو ٹائم ٹیبل بھی دیکھے۔ ایک حضور انور کا ایک سالار جنگ بہادر کا۔ اگر پہلے نقشے پر عمل درآمد ہوا کرے تو خوشا بحال ملک و مملکت۔ اور خدا چاہے تو طبیعت کا آجانا کچھ بڑی بات نہیں شوقِ طبع ہے۔ کاش انتظام و آراستگی ملک پر آجائے اور یہ خیال پیدا ہو جائے کہ دفعہ وہ کر کے دکھا دیجیے جو کبھی یہاں نہ ہوا ہو۔ اور اس وقت کہیں نہ ہو۔ دولت کی محبت انسان کی سرشت میں داخل ہے شاید کفایت اور

تکثیر کاصل کی سیڑھی سے اس بلندی پر آسان پہنچ جائیں۔ خافی خاں رقعات عالمگیری اور مشہور حکایتوں اور روایتوں سے عالمگیر اور نواب سعادت علی خاں مرحوم کے حالات انہیں سنوا یئے۔ اور ان کے لطائف و حکایات سے کان بھرتے رہیئے۔

آزاد

●

لاہور۔ بنگلہ ایوب شاہ

۲۰ر اپریل ۱۸۸۴ء

جناب من!

تسلیم۔ آپ تو ناحق گھراتے ہیں اور دیکھتا ہوں کہ ہر بات میں گھراتے ہیں۔ وہاں کا اخبار اسی طرح نکلتا ہے۔ میں نے اور مطابع میں دریافت کرلیا۔ جس وقت میرے پاس لفافہ پہنچے گا۔ انشاء اللہ اسی دن خدمت میں روانہ کیا کروں گا۔ کیا کروں کیونکر آپ کے دل میں اعتبار پیدا کروں!

نوکری کے باب میں دیکھتا ہوں کہ وہی مایوسی کے کلمے ہیں۔ یونیورسٹی پر آپ مجھے کیوں ڈالتے ہیں۔ یہ ہے کیا تعجب! آپ کے جد کی سرکار تو ہے۔ حضرت! اس غلام زاد کو آزاد کر کے وہ دست بردار نہیں ہوگی انشاءاللہ آپ دیکھیں گے اس سے بہتر صورت ہوگی اور بدرجہا بہتر ہوگی۔

... خوشا کجال آزاد کہ ۵۰ روپئے پنشن بھی ہو جائے تو ہزار ہزار شکر خدا کا

بجا لائے گا اور بغلیں بجا بجا کر رقص کرے گا۔

حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ اسباب جہاں
آنچہ ما درکار داریم اکثرش درکار نیست

آیا۔ پھر انشاء اللہ کیا خاطر جمع اور شگفتگیٔ طبع کے ساتھ تصنیف کو درست کروں۔

محمد حسین آزادؔ

●

۲ر مئی ۱۸۸۴ء

جناب من!

تسلیم۔ کل یکم مئی کو ایک قطعۂ شفقت بیمہ کو ارسال خدمت کیا ہے۔ خدا کرے پہنچ جائے۔ چاہتا ہوں کہ رجسٹری کروا کر بھیجوں مگر یہ سمجھ کر نہیں بھیجا کہ دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی۔ آپ کیا کہیں گے۔

الحمد للہ بندہ زادہ رڑکی پہنچ گیا۔ خدا دمولیٰ حافظ و ناصر ہیں۔ جمال الدین خان کوئی افغانی مضافات کابل کا ہے۔ اور پیرو ہے مہدی سوڈانی کا۔ اس نے پیرس میں آکر ایک اخبار عربی زبان میں جاری کیا ہے مختلف مقامات ہندوستان میں بھی اس کے پرچے آئے ہیں۔ ۴ نمبر میری نظر سے بھی گذرے۔ ارادہ ہے کہ خود لیکر حاضر خدمت ہوں۔ آپ نے وہاں کچھ چرچا اس کا سنا ہے یا نہیں۔ بھائی صاحب سے بھی لکھ کر حال دریافت فرمایئے گا۔ وزیر لنگران کے

قصہ میں جو الفاظ ہیں اس کی واکیو لیری[1] ہیں۔ سب موجود ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہماری کتابوں میں یعنی برہان قاطع وغیرہ فارسی کی فرہنگوں میں نہیں ہیں۔ وہ آپ الگ لکھتے جائیے۔ آپ فرمائیں گے کہ ہمیں کیا خبر ہے کہ کیا کیا الفاظ برہان میں نہیں۔ خیر میں خود چند گھنٹے صرف کروں گا۔

آزاد

●

۲۷ جولائی ۱۹۳۸ء

جناب من!

تسلیم۔ نائٹہ نامی ایسی حالت میں پہنچا کہ انتظار حد مایوسی کو پہنچ چکا تھا۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ پہنچا تو سہی۔ میں نے تو آپ سے کہہ دیا تھا کہ اگست سے چھٹیاں شروع ہوں گی۔ اور ۱۵ اکتوبر کو ختم ہوں گی۔ مگر آپ کو کب یاد رہتا ہے۔ دل بہت چاہتا ہے کہ میں آکر ملوں مگر فرصت کہاں؟ اور موقع کہاں؟

میرا حال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کے حکم بموجب لکھ بھیجا ہے کہ یکم اکتوبر سے میری تنخواہ یونیورسٹی سے ملا کرے۔ گویا اس تاریخ سے میں ان کے ماتحت سمجھا جاؤں گا۔ یا قسمت یا نصیب۔

فرصت کا حال یہ ہے کہ ۱۱ جولائی کو یہاں امتحان ملازمت تھا۔

---

[1] لغت

۵۷۲ آدمی امتحان میں بیٹھے تھے۔ مجھے باوجود انکار کے فارسی کا ممتحن کیا۔ ۳ پرچے جس کے ۱۷۱۲ کاغذ دیکھنے پڑے ہیں۔ ایک پلنگ بھرا ہوا ہے۔ دیکھتا ہوں اور لہو خشک ہوتا ہے کہ الٰہی یہ بوجھ کیونکر اٹھے گا۔ ۱۵ اگست کو ریزلٹ دینا ہے۔ فرمائیے کہ اس چھٹی کا مزا کیا ہوا۔ خدا گواہ ہے کہ بار بار انکار کیا نہ قبول ہوا۔ ناچار۔ طفل بہ مکتب نمیرود ولے برندش۔ انصاف کیجئے کہ اب تصنیف کے لیے طبیعت میں ذوق شوق پیدا ہو تو کہاں سے ہو۔ برابر خطوط چلے آتے ہیں کہ فرمائیے دربار اکبری کا کیا حال۔ قند پارسی (گفتگوے فارسی) کا کیا حال ہے۔ لکچروں کا کیا حال ہے۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ آزاد کا کیا حال ہے۔

تحفۃ العوام کا عکس جو مطلوب ہے۔ انشاءاللہ عنقریب دریافت کر کے عرض کر دوں گا۔

شفق کے پرچے الگ الماری میں رکھتا جاتا ہوں۔ تیار۔ آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ اس خط کا جواب آئے تو روانہ خدمت کر دوں۔

میں جیسا تھا ویسا ہی ہوں۔ نہ ساون ہرا نہ بھادوں سوکھا۔

ایک دن ایک صاحب زادے جن کا قیافہ شرافت اصلی پر گواہ تھا تشریف لائے کہ بلگرام کا رہنے والا ہوں۔ سیّد ہوں۔ یہاں پڑھنے آیا ہوں۔ سید مصطفٰے نام ہے سبحان اللہ۔

تاثیر ہے کیا خاک میں اس نجد کی کہہ دے — تو مجھ سے تو بارے
ہر پھر کے جو آ نکلے ہیں یاں ناقۂ لیلٰے — اے جذب محبت

بہر حال مجھے خیال ہوا کہ لڑکے ہیں ناتجربہ کار ہیں۔ مبادا گھر سے کسی بات پر ناراض ہو کر نکل کھڑے ہوئے ہوں۔ انہیں روک لیا اور اسی دن آپ کے بھائی صاحب کو لکھا۔ وہاں سے جواب چہ معنی دارد۔ خیر۔ وہ حقیقت میں جیسے شریف ہیں ویسے ہی سعید ہیں۔ چنانچہ تیسرے دن جماعت اول گورنمنٹ اسکول میں داخل کرادیا۔ دکن جانے کو دل بہت چاہتا ہے۔ مگر دُور کا سفر ہے۔ دوسرے دوسو روپئے کا خرچ ہے اور فائدہ کچھ بھی نہیں۔ فقط سیر تماشا۔ اس لیے غور طلب امورات کی مدّ میں رکھا ہوا ہے۔

شفق ابھی آیا۔ اکثر پرچے آپ کے دیکھنے قابل ہیں۔

بس حضرت اب پھر۔

دعا و التماس دعا
آزاد

●

۴؍ دسمبر ۱۸۸۴ء

جناب من!

تسلیم۔ مجھے کئی دن سے خیال تھا۔ الحمدللہ کہ خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ بیر لی سے یہ تو خوشی ہوئی کہ ایک دن لاہور کی منزل میں ملاقات ہوگی اور بہت سی باتیں۔ جو تحریر میں نہیں سمائیں زبانی ادا ہوں گی۔ مگر یہ خیال ہے کہ اب ہندوستان کی طرف بڑھتے چلے جائیں گے۔ تیرہیں نے کون سا پنجاب سے

نکاح کیا ہوا ہے۔

سبحان اللہ۔ سکوں کا شوق آپ کو کب ہوا۔ جبکہ سکوں کی کان سے آپ جدا ہوتے ہیں۔ جہلم سے لیکر پشاور تک سکوں کا گورستان ہے۔ مجھے آپ سے زیادہ شوق تھا۔ مگر ۵ برس ہوئے میرے ۲۔۳ سو سکے دفعۃً کم ہوگئے ایسا صدمہ ہوا کہ اب تک جب خیال آتا ہے دل تڑپ جاتا ہے۔ بیزار ہوگیا۔ اور خیال کا بھلانا مصلحت دیکھا۔ دکان دکان پھر کر اور گدائی کر کے برسوں میں جمع کئے تھے۔ ہزاروں میں انتخاب کر کے رکھے تھے۔ اور تمام گریک[1] تھے۔ ہائے افسوس رنج ہوتا ہے۔ نہیں لکھا جاتا ہے۔ آپ کے لیے جس قدر ممکن ہوگی کوشش کروں گا۔ جب لاہور کے قریب پلٹن پہنچے تو مجھے ضرور لکھئے گا۔

وہ سید مصطفےٰ خلف سید ابن علی صاحب بالگرامی یہاں بیمار ہو گئے۔ اُن کی بیماری نے طول کھینچا۔ بخار ایسا لپٹا کہ نہائت ضعیف کر دیا آدمی گیا اور خدمت گیا۔ بیمارداری تیمارداری گیا۔ میر اللہ کا ایک دن خبر لایا کہ میں گیا تھا۔ مجھے چند باتوں کے بعد انہوں نے پہچانا۔ یہ سُن کر میرا دل نہ رہ سکا۔ انہیں مکان پر لے آیا۔ اب آپ کے جد کے تصدق سے اللہ نے مجھ روسیاہ کی دعائیں قبول کیں۔ اور انہیں شفا دے دی۔ چنانچہ

---

[1] یونانی

۲۹ نومبر کو بخیر و عافیت روانہ حیدر آباد ہوئے۔ اب یہ دعا ہے کہ یہ خیر و سلامت اپنے بزرگوں کے پاس پہنچ جائیں۔

مولوی صاحب کو خط لکھیئے تو میری طرف سے بھی تسلیم لکھئے گا۔ اور بھائی تو آزاد کو کیا جانیں گے۔ دعا ضرور لکھیے گا۔

دعا کا محتاج

بندہ آزاد

●

یکم ستمبر ۱۸۸۶ء

عالی جناب من۔ زاد اللہ اجلالکم۔ تسلیم۔ احمق کا قاعدہ ہے کہ اپنی تعریف سُن کر خوش ہوتا ہے۔ میرا یہ حمق حد سے بہت زیادہ گذر گیا ہے کہ تعریف سُن کر غصّہ آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ میری تصنیف کے باب میں کچھ نہ کہا کریں۔ کیا کہوں فرصت تو ہے نہیں۔ اور دل یہ چاہتا ہے کہ آپ کے ایک ایک فقرہ کے جواب میں ایک ایک کتاب لکھوں۔

اخلاق جلالی کو میرے ایک شاگرد نے سوالوں میں ترتیب دیا ہے۔ انشاء اللہ جلد بھیجتا ہوں۔ آپ ہمیں بھول جایئے ہم تو آپ کو نہیں بھول سکتے۔ اس کی انگریزی نہ دیکھا کیجیے۔ وقت ضائع ہو گا۔ یہ سوالات انشاء اللہ امتحان کے لئے بہت مفید ہوں گے۔ سفر کا سلسلہ نہیں بھلاتا۔ انشاء اللہ سفر نامہ مرتب ہو گا تو دیکھیے گا۔ گرامی کو میں خوب جانتا ہوں۔

نیورسٹی پنجاب میں بھی پڑھا ہوا ہے۔ وہاں سے نکل کر بھی کئی سال تک مجھ سے
لتا رہا۔ ۱۲ برس کا مسلسل مشاق ہے اور جس رنگ میں لکھتا ہے۔ اس میں
ج اول درجہ کا شاعر ہے۔ اس کی طبیعت خیال بند ہے۔ جلالؔ، اسیرؔ، قاسم شہیدی
ہوریؔ وغیرہ ہند میں اسی طرز میں کہتے تھے۔ افسوس کہ سخندان فارس مشتہر نہیں
ہوا جو میرے اس مختصر فقرہ کا مفصل مزا آجاتا۔۔۔۔ میں نے سخندان فارس
و نظر ثانی کر کے رکھ دیا ہے۔ چاہا کہ اب دربار اکبری کو سنبھالوں مگر مروت
ور حمیت نے اجازت نہ دی کیونکہ استاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہت
ی غزلیں قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا
رتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ اگر میں ان کے باب میں بے
روائی کروں گا تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ جو دریا میں سے قطرہ رہ گیا ہے۔
ے موت مر جائے گا اور اس سے زیادہ افسوس کا مقام کیا ہوگا۔ ان کے حال
افسوس نہیں۔ یہ میری غیرت اور حمیت پر افسوس ہے۔ اس لیے اب سنبھالا ہے
وراس میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جس قصیدے یا غزل یا شعر کے موقع پر کوئی تقریب
وئی معاملہ یا معرکہ خاص پیش آیا تھا وہ بھی نقل کر دوں۔ کیونکہ میں ہر وقت
حاضر باش تھا اور والد مرحوم اور وہ عالم طفولیت میں ساتھ رہے۔ آپ
س کے لطف کو تصور فرمائیے۔ آج تک کسی شاعر کا دیوان ایسا مرتب نہ ہوا
وگا۔ خدا انجام کو پہنچا دے۔

آزاد

بنگلہ ایوب شاہ

جناب من!

تسلیم۔ میرا اصل نیاز نامہ بھیج دیجئے۔ کچھ مضائقہ نہیں ہے کیونکہ اگرچہ ابھی تک ایسی حالت نہیں کہ انہیں کچھ فکر کرنا پڑے۔ لیکن ہر حال کی مسلسل اطلاع انہیں اچھی ہے - - - - آپ انہیں احمق سمجھتے ہیں؟ ابتدائے مطلب برآری میں یہ لوگ احمق ہی ہوتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں۔ احمق بن کر کام خوب نکلتا ہے۔ جب جال جم جاتا ہے پھر دیکھئے کیا عالم ہوتا ہے۔ مالک کل! اور تم کون؟ تمہیں کیا دخل؟ تمہیں کیا اختیار؟ ایک جز ان کی پالیسی کا یہ بھی ہے کہ فقط انگریزی پڑھاؤ۔ سائنس وغیرہ کچھ ضرور نہیں۔ لیکن آپ خیال کیجیے۔ علوم مذکورہ زبان کے لیے بمنزلہ اعضائے رئیسہ کے ہیں۔ اگر وہ بالکل نہ ہوئے تو پھر آدمی کیا ہوا؟ وہ تو حیوان ہوا ہاں یہ ضرور ہے کہ طرز خاص اور مقدار خاص تک ہوں۔

پالیسی عجب لفظ ہے! کہیں اس کے معنے تجویز کے ہوتے ہیں کہیں مصلحت۔ کہیں مصلحت وقت۔ کہیں حکمت عملی۔

بس حضرت اب پھر۔

آزاد

تسلیم۔ اللہ اللہ۔ اس وقت کیا دل خوش ہُوا ہے اور کیا غصہ آیا ہے۔ میں تو صبر کر بیٹھا تھا۔ اب سلی ہوئی بارود کو آگ دینی کیا ضرور تھی۔ مجھے آپ خط نہ لکھا کریں۔

دلربائی ہائے لیلی کرد مجنوں را خراب
ورنہ آں بیچارہ راسیل گرفتاری نبود

خیر یہ تو باتیں جب مزا دیں کہ آپ اور میں آمنے سامنے بیٹھے ہوں۔ مطلب کی باتیں پہلے عرض کر لوں۔

دیوان حافظ، اخلاق جلالی۔ ابوالفضل نول کشور نے چھاپی ہے اور خوب محشی ہے۔ ایک ایک نسخہ لیجیے اور دیکھ ڈالیے۔ آپ کے نزدیک کچھ بڑی بات نہیں۔ دیوان حافظ پر صوفیانہ حاشیے ہیں۔ نیز اس سے آپ بنا مطلب نکال سکتے ہیں۔ آپ کے دل پر ان کتابوں کا بھرم بیٹھا ہوا ہے۔ اس لیے آپ دیکھتے نہیں۔ دیکھیے گا تو معلوم ہو جائے گا۔ آسان کام ہے۔ اخلاق جلالی پر جو حاشیے ہیں۔ وہ اس کے لیے کافی ہیں۔ آپ خاطر جمع رکھیں .... گفتگو آپ مشکل فرماتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں۔ لکھنؤ میں دو رسالے عربی ڈائیلاگز[1] دو شخصوں نے جدا جدا لکھے ہیں۔ وہ کسی کو لکھ دیجیے۔ بھیج دے گا۔ اور پڑھنا شروع

---

[1] مکالمات

کیجیے۔ حفظا ہو جائیں گے۔ امتحان میں اس کے یا اُسی قسم کے فقرے ممتحن بولے گا۔ آپ کو یہ بات مشکل نہیں ہوگی۔ کہ توڑ جوڑ کر کے الٹے سیدھے جواب دیں اور اس کی خاطر جمع کر دیں۔ ہمت نہ ہاریے۔ چُپکے نہ رہیئے گا۔ اُلٹا سیدھا جھوٹ سچ بولے جائیے گا۔

زبان فارسی کی تاریخ میں پروفیسر آزاد ایک شخص ہیں۔ انہوں نے تین چار لکچر خوب دیئے ہیں۔ اور زبان مذکور کے اصول اور بہت حالات اور بھی لکھے ہیں۔ ۳۔۴ سو صفحہ کی کتاب ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ وہ ابھی مسوّدے ہیں۔ عجب نہیں کہ ہو جائے تو جلد چھپوا دیں۔

ہاں قواعد فارسی میں ایک کتاب ڈائرکٹر صاحب کی فرمائش سے میں نے لکھی تھی۔ اس کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ اور کتب خانہ آزاد سے فاضل ہے۔ وہ انشاء اللہ روانہ کرتا ہوں۔ (خدا کرے بھول نہ جاؤں)

آپ دیکھیے گا۔ قواعد کی کتاب ہے اور اصول وضوابط بیان کیے ہیں۔ اور پھر دیکھئے کہ طرز بیان کو ہاتھ سے نہیں کھویا۔ یہ بھی دیکھیے گا کہ مثالیں کیا خوش آیند بہم پہنچائی ہیں۔ اور زبان کو اور محاورہ کو کس قدر قوت دیتی ہیں۔ خدا کرے آپ کو پسند آ جائے۔

ہاں کیا خوب یاد آیا ہے۔ بمبئی میں ایک کتاب کسی نے چھاپی ہے دیباۓ رومی۔ اس میں ترکی اور عربی کی گفتگو لکھی ہے اور اسقدر مبسوط ہے

کہ اگر آپ اسے یاد کرلیں تو کافی و وافی ہوگی وہ بھی منگوا لیجیے۔ اگر نہ ملے تو مجھے لکھئے۔ کتب خانۂ آزاد میں ہے فوراً ارسال خدمت کر دوں گا۔

آزاد

●

عالی جناب من تسلیم۔ مدت گذر گئی کہ خدمت سے مقصر ہوں مگر عالم مجبوری ہے کہ آب حیات میں غوطے کھا رہا ہوں۔ انشاء اللہ ایک مہینے کا کام اور ہے۔

حیدر آباد کے حالات اتنے ہی معلوم ہیں جتنے اخباروں میں لکھے جاتے ہیں۔ اڈیٹر شفیق اتنے اختیار اور اتنے عہدہ کو نواب لائق علی خاں کے لیے کافی نہیں سمجھے۔ میری عقل ناقص میں غل مچانے سے کچھ حاصل نہیں۔ گورنمنٹ کو جو کرنا تھا وہ کر دیا۔ جو کچھ ہو گیا وہی مناسب ہے۔ اب نہایت خاموشی اور دعرق ریزی سے اس کی تعمیل کرنی چاہیے لیکن اتنا خیال ضرور ہے کہ سکریٹری ہیں۔ صاحب قلم نہیں۔ فقط قلم ہو جائیں۔ جو کہا سو کر دیا۔ جو حکم دیا اس کی تعمیل کر کے لکھ دیا۔ اپنی طرف سے سر مُو دخل نہ دیں۔ میں نے کئی جگہ دیکھ کر ایسے مواقع کا تجربہ حاصل کیا جب بالیاقت شخص بے لیاقت اشخاص کے ماتحت ہو جاتا ہے تو اس سے بے ضابطگی دیکھی نہیں جاتی۔ خواہ مخواہ بول اٹھتا ہے۔ اُسے یہ بھی خیال ہوتا ہے

کہ میری ہدایت سے یہ لوگ میرے احسان مند ہوں گے اور میری لیاقت کو تسلیم کریں گے۔ لیکن برخلاف اس کے وہ لوگ اس کی بات کو رد کرتے ہیں۔ موتیوں کو خاک میں ملاتے ہیں۔ اور کبھی کچھ اس کی صورت کو اول بدل کر کام میں بھی لاتے ہیں اور جن باتوں سے ناواقف ہوتے ہیں انہیں سیکھے جاتے ہیں۔ اور تردید کرتے جاتے ہیں۔ اور اس شخص کی عقل و دانش کو دیکھ کر اور زیادہ خطر دل میں پیدا کرتے ہیں۔ ان لحاظوں سے جہاں تک ہوسکے بے وقوف بن کر چپ چاپ کام کیے جانا چاہیئے۔ اور لیاقت اور معلومات کو دبائے ہوئے احکام کی تعمیل بڑی کوشش سے کئے جانے چاہیئے ۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ اس موقع پر بڑی دانائی یہی ہے کہ اپنی آگاہی اور لیاقت دبائے ہوئے سب کے ساتھ ساتھ بلکہ پیچھے پیچھے چلے چلیں۔

تا محتسب نگوید اسرار عشق و مستی
تا بے خبر بمیرد در بند خود پرستی

آزاد

●

جناب من تسلیم۔ آپ کو معلوم ہے کہ ۶ دن تک پولوس مقدس کا لاہور میں نزول رہا۔ ایک عالم تہ و بالا تھا۔ آزاد بھی انہی کی گرفتاری میں رہا۔ اس لیے نیاز نامہ نہ لکھ سکا۔

جس فارسی ڈرامہ کا آپ نے حال بیان فرمایا تھا۔ وہ میں نے لیکر دیکھا۔ عہ ۲؍ اس کی قیمت ہے۔ اس لیے خرید کر بھیجنا مناسب نہیں سمجھتا۔ آج کل میں یہاں سے کتب خانہ گورنمنٹ اسکول کے لیے امرتسر کو کتابیں روانہ ہونے والی ہیں۔ اُن میں اسے بھی لکھوا دیا ہے۔ عنقریب وہاں پہنچے گا۔ اور میں بھی لکھوں گا۔ وہاں سے لیکر دیکھیئے گا۔ یا میں خود لیکر حاضر ہوں گا۔ نسخۂ مذکور جب تک جی چاہے اپنے پاس رکھیئے گا۔

میں نے اسے دیکھا اتنی بات ضرور ہے کہ لکھنے والے نے جو کچھ لکھا ہے ڈراما کے اصول کے بالکل مطابق لکھا ہے اور نتیجہ بھی برجستہ نکالا ہے یعنی بڑھاپے کی شادی اور دوسری شادی کی تکلیفیں اور قباحتیں بتائی ہیں۔ لیکن چونکہ ابتدائی تصنیف ہے اس لیے تحریر میں پھیلاؤ۔ اور بات کو بڑھاتا۔ اور مزے لے کر کہنا۔ کوئی مصرع۔ کوئی فقرہ مقفّیٰ۔ کوئی لطیفہ کوئی چٹکلہ وغیرہ وغیرہ۔ یہ لطف ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ خیر جو کچھ کیا ہے نہایت غنیمت ہے۔ عربی فارسی میں یہ شاخ انشا پردازی کی بالکل نہ تھی۔ بڑی بات ہے کہ زمینِ سخن میں ایک قلم تو لگائی۔ شاخ و برگ بھی نکل آئیں گے۔ گل پھول بھی کھِل جائیں گے۔ ابتدا میں ایسا ہی ہوتا ہے اگر زمانہ فرصت دے تو انشاء اللہ اردو میں ایک ڈرامہ لکھ کر میں بھی نمونہ دوں گا۔ دل تو بہت کچھ چاہتا ہے مگر اکیلا آدمی کیا اور سے سامان کیا کیا کچھ کرے

یک دل و خیل آرزو دل بہ کجا کجا بہم   سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا بہم

آزاد

حواشی اور تعاقف

آزاد نے اردو زبان کی مختصر تاریخ میں ایران کا بھی ذکر کیا ہے۔ سنسکرت اور ایرانی زبان کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ آزاد نے ان ابواب میں جو لسانی بحث کی ہے وہ زبان وادب کے جملہ مسائل کی تشریح و تفہیم کے لیے استعمال کی گئی ہے اور لفظ شناسی کی جو وسیع مثالیں ملتی ہیں ان کی رو سے آزاد کی فنی اور علمی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ وہ موضوع کی مقصدیت کو رضرت انگیز کرتے ہیں، عالمانہ تفکر سے کام لیتے ہیں۔ اور جستہ جستہ آرائشی تفکر کو بھی موضوع کے ہم رکاب رکھتے ہیں جس کی وجہ سے موضوع کی عروجی آرائشی حیثیت مفلوج نہیں ہوتی اور نہ اس کی روانی کے فوت ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ جگہ جگہ نوری بتوں کی استادگی معنی ومفہوم کو منور رکھتی ہے۔ ان صفات کی نمو پذیری میں آزاد کے تخلیقی ذہن اور اجتہادی روش نے مدد کی ہے۔ ان کی بُرّد اور غیر مجرد تصویریں ابتدا تا آخر موجود ہیں۔

نظم اردو کی تاریخ سے متعلقہ باب میں مختلف ادوار کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ان . . . . . تفصیلی مباحث میں خوبیوں کے ساتھ کچھ خامیاں اور کمزوریاں بھی ہیں جو وسائل کی کمی اور نمونوں کی کمیابی کے باعث پیدا ہوئی ہیں کیوں کہ آزاد کے سامنے اردو شاعری کے قدیم تذکرے تھے۔ یا وہ واقعات جو زبان زد وخاص وعام تھے۔ حالانکہ جن روایات یا واقعات کو آزاد نے زبان دی ہے انہیں آج کی تحقیق نے صحیح ثابت کردیا ہے گوکہ ایک زمانہ تھا کہ آزاد پر انگلیاں اٹھائی جاتی تھیں۔ وہ نگار کے صفحات ہوں

پانچ محفلوں میں یا آزاد سے متعلقہ مضامین اور کتابوں میں۔ یہ آزاد کا احسان ہے کہ انہوں نے ماضی کو حال تک پہنچایا اور بزرگوں کے اس قیمتی ورثے کو زمانے کی گرد و باد سے محفوظ کر دیا۔ یہ باب پانچ مجلسوں پر مشتمل ہے۔ ہر باب کی لسانی خصوصیت اور طرز بیان کی تبدیلیوں کے متعلق دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ آب حیات بیک وقت ادب کی تنقید اور معاشرے کی تصویر کھینچنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ اب اگر کسی کو کسی دور کی یا کسی خاص شخص کی تصویر ناقص یا ٹیڑھی یا آڑی ترچھی نظر آتے تو اس میں قصور آزاد کا نہیں دیکھنے والے کا ہے۔

ان ابواب کے ذکر سے انہوں نے "نظم اردو کی تاریخ" بیان کی ہے اور جگہ جگہ شگفتگی و تازگی کے پھول ٹانکے ہیں۔ یہ حصہ بھی عالمانہ ہے۔ امیر خسرو کے نام نامی سے لے کر سعدی کاکوروی، کبیر و تلسی۔ احمد گجراتی، سیوا، نواز، موسوی خاں فطرت، قزلباش خاں امید، ولی دکنی، شاہ حاتم، سودا، ذوق، قائم، میر، غالب، مومن، خواجہ میر درد، جرأت، ناسخ، رند، صبا، وزیر، انیس و دبیر تک کی نظمیہ تاریخ بیان کی گئی ہے اور ان باکمال شعرا کے حوالے سے مختلف دور کی ادبی حیثیت اور مقام و مرتبہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

آب حیات کی مجالس ولی دکنی کی غزل خوانی سے شروع کی گئی ہے۔ پہلی مجلس شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی،

احسن، غلام مصطفٰے خاں یک رنگ۔ دوسری مجلس شاہ حاتم، خان آرزو اور اشرف علی خاں۔ تیسری مجلس مرزا مظہر جان جاناں، سودا، میر ضاحک، خواجہ میر درد، میر سوز۔ چوتھی مجلس جرأت، میر حسن، انشاء، مصحفی اور پانچویں مجلس ناسخ، ضمیر، آتش، خلیل، نصیر، مومن، شیفتہ، ذوق، دیراں، غالب، دبیر و انیس وغیرہ جیسے نامور شعرا پر مشتمل ہے۔ جن کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔ ضمنی طور پر چند اور شعرا کے نام لیے گئے ہیں۔ انھوں نے ان شعرا کے سلسلے سے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے ذریعہ اس دور کی لسانی اور شعری حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دور کی تہذیبی سطح کیا تھی اور وہ کس حد تک اردو شاعری کے ارتقاء میں معاون رہی ہے۔

نیرنگِ خیال:

"نیرنگِ خیال" دو حصوں میں منقسم ہے زمانۂ تصنیف ۱۸۸۱ء ہے۔ حصۂ اوّل دیباچہ کے ساتھ ۱۳ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں جو طرز نوی اختیار کی گئی ہے وہ اردو کے لیے نئی چیز تھی۔ مگر یونانیوں اور رومیوں کے لیے ایسی تحریریں باعث حظ تھیں۔ انگریزوں نے بھی اس صنف کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ Pilgrims Progress (زایر کا سفر) ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں مسیحی عقیدوں اور اخلاق محسنہ کو محسوس طریقوں پر بیان کیا گیا ہے۔ "کہا جاتا ہے کہ انجیل کے بعد جس کتاب نے مسیحیت کے قبول کرنے کی

سب سے زیادہ ترغیب لوگوں کے دلوں میں پیدا کی، وہ یہی سفرنامہ ہے۔[1]
چنانچہ اسی ضمن میں اڈیسن، جانسن، اسپنسر کے خیالی مضامین اور مشرقی زبانوں میں انوار سہیلی، ستپدیشن، اخوان الصفات، سب رس وغیرہ کی بھی مثالیں موجود ہیں۔

آزاد کا تخلیقی رنگ و آہنگ اس کتاب (نیرنگ خیال) میں قدرے شوخ ہو گیا ہے۔ انشا پردازی کے وہ گل بوٹے کھلائے جن کی خوشبو آج تک باقی ہے۔ ایسی خوبی کہ کوئی اس رنگ کو منتقل نہیں کر سکا۔ ان انشائیوں میں حسن کاری، وارفتگی، موزونیت، شعریت، تخیلی قوت، اور انسانی زندگی کی بنیادی حقیقتیں موجود ہیں۔ ان سب نے مل کر ان انشائیوں کو قدر اول کی چیز بنا دیا ہے جو آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہیں۔ سیر زندگی، گلشن امید کی بہار، آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار وہ انشائیے ہیں جن میں آزاد کا تمثیلی اور علامتی انداز نمایاں ہے۔ غیر مرئی کو مرئی صورت دے کر انسانی سرشت اور اس کی حقیقت کو جس نوع سے مجسم کیا ہے۔ انہیں کا حصہ ہے۔

ان کا آخری مضمون (شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار) عالمی

---

[1] مولانا سعید انصاری بہ حوالہ: جہاں بانو نقوی

شخصیتوں کے ذکر کے ساتھ ہی تاریخی نوعیت کا حامل بھی ہے۔ جس میں مغل بادشاہوں، فارسی اور ہندوستانی شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے خاص طور پر انہوں نے اُردو شعرا کے ذکر میں جو کمی آبِ حیات میں باقی رہ گئی تھی، اسے انہوں نے پورا کر دکھایا ہے اور اس کی تکمیل میں وہی ہوس کار فرما ہے جو بادشاہوں کو ملک گیری میں ہوتی ہے۔ اس مضمون میں ان کی حیثیت ایک فاتح کی ہے اور شعرا کا ذکر ایک مفتوح کی طرح کیا گیا ہے۔

اسی طرح اس کتاب کا دوسرا حصّہ بھی اپنی سدا بہار تحریروں سے زندہ ہے مگر اس حصّہ کو وہ قبول عام کا درجہ نہیں مل سکا۔ جو حصّہ اوّل کو حاصل ہے۔ آزاد کی وفات کے بعد ان کے پوتے آغا محمد طاہر نے مفید دیباچہ کے ساتھ ۱۹۲۳ء میں شائع کرایا۔ اس میں کل چھ مضامین شامل ہیں۔ جنت الحمقا، خوش طبعی، نکتہ چینی، دفع خوش بیانی، سیر عدم اور بقائے دوام سب ہی مضمون میں انسانی خصلت و عادات کو مشخص کرنے کی ماہرانہ کوشش کی گئی ہے اور اسی روح کو اس میں حلول کیا گیا ہے جو حصّہ اوّل کو مقبول اور خاص و عام بنائے ہوئے ہے مگر اس حصّے کے نامقبول ہونے میں "پیش رو تکرار" ذمہ دار ہے۔ کوئی بات یا کوئی نیا پہلو اس کے کسی مضمون سے ظاہر نہیں ہوتا۔

دربارِ اکبری: دربارِ اکبری کا چوتھا اڈیشن (۲۰۰۰ کا) قیمت ۵/- ۱۹۲۷ء میں شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے شائع کیا تھا جس کا مقدمہ محمد ابراہیم صاحب

(پسر محمد حسین آزاد) نے ۱۳ر اگست ۱۹۱۰ء کو لکھا اور شامل کیا۔

اس کا پہلا اڈیشن رفاہ عام لاہور نے شائع کیا تھا۔ جس کے مالک و مہتمم میر ممتاز علی (پدر بزرگوار امتیاز علی تاج) نے مقدمہ بھی خود ہی لکھا۔ لیکن ۱۹۲۷ء کے اڈیشن میں پسر آزاد (محمد ابراہیم) نے ناچیز غلط اصطلاحات اور اندراجات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ممتاز علی صاحب کی روش بے جا کی شکایت کی ہے۔

سب سے زیادہ افسوس ناک غلط بیانی میر صاحب کے لکھے ہوئے مقدمہ میں تھی کہ انہوں نے حضرت قبلہ مرحوم کی نسبت یہ تحریر کیا کہ وہ "یہ سُن کر کہ میں ان کا مسوّدہ لینے کے در پے ہوں جوشِ جنوں میں مسوّدات کا ایک بستہ لے کر دریائے راوی پر پہنچے اور پُل پر کھڑے ہو کر اس کو دریا برد کر دیا۔ یقین کیا جاتا ہے کہ اس میں دربار اکبری کا صاف شدہ مسوّدہ ہوگا" اس فرضی دریا بردگی کے قصّہ پر (جس کا علم سوائے میر صاحب کے کسی اور شخص کو نہیں جو غالباً اس وقت ہمراہ ہوں گے) میر صاحب موصوف نے کمال اندوہ و قلق درد و سوز کے ساتھ یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ "خدا جانے اس سخن ور نے نظم و نثر کے کیا کیا موتی پروئے ہوں گے جو ہماری بدقسمتی سے دریا میں غرق ہو گئے۔" غرض کہ میر صاحب کے اس بیان کے ساتھ جب ان کے مزید ایسے بیانات کو شامل کیا جائے جن کا ماحصل یہ ہے کہ جو مسوّدہ شاگردوں کا صاف کیا ہوا تھا وہ غلطیوں کا مجموعہ تھا اور جو مسوّدہ مصنف کے اپنے ہاتھ کا لکھا

ہوا تھا وہ بے شمار چھوٹے چھوٹے پرزوں پر تھا جو علاوہ بہت کٹے ہوئے اور مشکوک و مشتبہ ہونے کے پڑھے جانے کے بھی قابل نہ تھے۔ اور پنسل کی لکھی ہوئی تحریریں محو ہو چکی تھیں اور انہیں وجوہات سے میر صاحب کے مسودے میں جا بہ جا تصرفات کرنے پڑے (جس میں کہ حذف اور ایزاد اور تبدیلی غرض کہ ہر قسم کے تصرفات شامل ہیں) اور اوراق کے اوراق جو گم تھے ان کی گم شدگی دیکھ کر بہ قول میر صاحب" بجز اس کے اور کیا چارہ ہو سکتا تھا. کہ اس حصّہ ناقص کو میں خود لکھ کر پورا کروں؟" تو ان بیانات کے مطالعہ سے پڑھنے والے کے دل پر سوائے اس کے اور کیا اثر پیدا ہو سکتا تھا کہ بحیثیت مجموعی کتاب دربار اکبری در اصل تقریباً میر صاحب موصوف ہی کی عرق ریزی اور محنت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ حضرت قبلہ مرحوم کے صاف کردہ مسودات تو دریائے راوی میں ہی غرق ہو چکے تھے۔ علاوہ بریں بہ قول میر صاحب موصوف ضمیمہ "دربار اکبری" تو تمام و کمال ہی میر صاحب موصوف کا اپنا لکھا ہوا ہے۔

ابراہیم صاحب نے بڑی تفصیل سے ان تمام امور پر سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ جس سے غلط روایت پنپ سکتی تھی"۔۔ تایدِ غیبی یہ ہوئی کہ میر صاحب موصوف نے "دربار اکبری" چھاپنے کے بعد یہ کتاب مذکور کا مسودہ جو میں نے ان کو دیا تھا مجھے واپس کر دیا اور دیتے وقت وہ تتمہ کا مسودہ دستخطی حضرت مرحوم بھی نکالنا بھول گئے جس کی نسبت انہوں نے ایسی دلیری سے لکھوایا تھا کہ وہ قریباً تمام و کمال ہی ان کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔"

اس تاریخی کتاب میں اکبر اور اس کے اجزاء کے دلچسپ حالات بیان کیئے گئے ہیں۔ اکبر کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جو اس میں موجود نہ ہو۔ اکبر جتنا بڑا حکمراں تھا اتنا ہی بڑا ہندوستان دوست بھی تھا۔

اکبر کی جنگی مہمات، تفریحی مشغلے، ملکی سیاست، اس عہد کی تصانیف اور عمارتوں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزہ میں جادو نگار قلم کی مدد سے ایک عہد کی وہ جامع تاریخ مرتب کی ہے جس کو پڑھا بھی جا سکتا ہے اور محسوس بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس میں مصوری سنگ سازی، شاعری اور موسیقی کی مجمع صفتیں موجود ہیں۔ آزاد نے اکبر کی ہمہ جہت شخصیت کو جس نوع سے مشخص کیا ہے۔ نہ کسی نے کیا ہے نہ کوئی اب تک کر سکا ہے۔ اکبر اس کتاب میں ایک عظیم حکمراں ہی نہیں ایک بڑا آدمی بھی ہے۔ اور بڑے آدمی کے ساتھ وہ امرا بھی جو کوتاہ قد تھے۔ انہیں آزاد کے قلم نے قدآور بنا دیا ہے۔

آزاد نے تاریخ جیسے خشک موضوع کو سیال شکر کی طرح برتا اور استعمال کیا ہے۔ ان کے بیان کا انداز تاریخی کم، تخلیقی زیادہ ہے۔ آزاد کا تخیل، قوت نقد و تحقیق اور تاریخ کی نثری سنجیدگی سے عاری ہے۔ وہ اپنے بیانیہ اسلوب کی مدد سے تاریخی واقعات اور معاشرتی حالت کی ظاہری اور اندرونی زندگی کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ عظیم تاریخی کتاب بے انتہا دلچسپ بن جاتی ہے اور قاری اس میں خود کو ڈبو دیتا ہے اور جب ڈوب کر

اُبھرتا ہے تو ایک ایک چیز اور ایک ایک نکتہ از بر ہوتا ہے۔

آزاد کو اپنا ماضی بہت عزیز ہے۔ اسی لیے شہزادوں، شہزادیوں، بیگمات، کنیزوں، باندیوں اور امرا کا ذکر جوش و مسرت کے ساتھ کرتے ہیں مگر ہوش و ہواس کا دامن نہ چھوڑتے اور ان کو شکستہ ہونے دیتے ہیں۔ انہوں نے جس محبت و عقیدت اور احترام کے ساتھ اکبر کی سلطنت اور اس کی شہنشاہیت کا نقشہ کھینچا ہے، وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اپنے ماضی سے الگ رہ کر خود کو ادھورا جانتے ہیں۔ اسی لیے وہ مصاحبین اور امرا کے ذکر میں بھی اسی جذبۂ عقیدت کو ملوث رکھتے ہیں۔ یہ جذبۂ عقیدت خواہ کسی سے ہو یا کسی پُر جلال عمارت سے۔ یہ ماضی پرستی ہی کا دوسرا نام ہے۔ جسے خوب صورت لفظوں میں چھپا کر اس کی عریانی ڈھانکی گئی ہے۔

بیرم خاں، عبدالرحیم خان خاناں، علی قلی خاں اور راجہ مان سنگھ وغیرہ کے تذکرے میں آزاد کی ارادت مندی پورے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔

دربار اکبری کا مطالعہ صرف تاریخ کے نقطۂ نظر سے کرنا مناسب نہیں کیوں کہ آزاد نے اس کتاب کے ذریعہ اس دور کی تہذیب، معاشرت کی خو اور بو دونوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہی جذبہ کار فرما تھا۔ جو مفتوح قوموں کو اپنے اچھے، خراب ماضی سے ہوتا ہے۔ وہ اسے کسی حال میں بھی بھولنا نہیں چاہتا اور اس کے دل و دماغ میں یہ بات رقصاں رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ماضی ہمیں پھر واپس مل جائے۔ آزاد کی بھی

یہ وابستگی اسی جذبہ سے متعلق ہے جو شکست خوردہ یا مفتوح قوموں کا مقدر ہوتا ہے۔

سیرِ ایران: سیرِ ایران لگ بھگ دو سو صفحات پر مشتمل سفرنامہ ہے۔ دیباچہ آغا محمد طاہر کا ہی رقم کردہ ہے۔ اس دیباچہ سے وجوہ سفر اور ترتیب و تشکیل کی نوعیت اور ضرورت کے متعلق یہ پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنے آبا و اجداد کے کتب خانہ کو بڑھانے اور باقی رکھنے کی خواہش تھی تاکہ "کسی قسم کے ضرورت مند کو کسی بدماغ سے التجا کرنے کی ضرورت نہ پڑے" چناں چہ اس خواہش کی تکمیل میں "اگر کوئی کتب حسب دل خواہ مل جاتی تو کتب خانہ کے لیے خرید لیتے"۔ اور یہی وہ جنون زدگی تھی جو انہیں ایسے دور افتادہ ملک کی طرف لے گئی۔ ان کا سفر تحقیقی اور علمی اعتبار سے بے حد کارآمد ثابت ہوا۔

شروع میں "شرفائے قوم" کے نام سے جو خطبہ شامل ہے اس خطبے میں سفر کے حالات و تاثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ سفر ستمبر ۱۸۸۵ء کو کیا گیا۔ کئی مہینوں پر مشتمل اس سفری سرگزشت میں شیراز، دورِ عباسیہ کی عمارات، اصفہان، طہران، مشہد مقدس، سمنان، شاہ رود، بسطام، سبزوار، نیشاپور، دامغان، ہرات اور قندھار وغیرہ کا ذکر نہایت لطیف پیرایہ میں کیا گیا ہے۔

آزادؔ کا یہ سفر لاہور سے بوقت شام ۲۳ ستمبر ۱۸۸۵ء کو براست

کراچی شروع ہوا تھا۔ لیکن تاخیر کے باعث ایک ہفتہ مزید کراچی میں قیام کرنا پڑا۔ سمندری سفر ان کا پہلا تجربہ تھا۔ اس تجربہ کی تصویر بہت دلکش کھینچی ہے۔ شیراز اور اس کے اطراف و اکناف کی سیر کی۔ حافظ و سعدی کے مزارات کی زیارت سے فیض یاب ہوتے۔ غرض کہ "شیراز کی ہر نبض دیکھی" اور اگلی منزل کا ذکر لطیف یوں کیا ہے کہ:

"شیراز جب دیکھ لیا تو بڑھاپے کے خوف نے لحاف میں دبک کر کہا اب اصفہان دیکھ اور آگے بڑھ کر تلاش کی، منزل ابھی دور ہے۔"

یہی وہ مثبت "تلاش" ہے جس کے لیے آزاد نے بہ حالت ضعیفی اتنا طویل اور تھکا دینے والا سفر اختیار کیا، ان کی تلاش میں وہ علمی پیاس وابستہ ہے جو انہیں وطن سے اتنی دور لے گئی اور دیار غیر کی گرد و باد کا ذائقہ چکھنے اور اس کے برتنے کے ہنر سے آشنا کیا اور یہ برملا کہا کہ "یہ شہر سلاطین صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ ہے۔" غرض کہ دوسرے شہروں کی گرم و سرد ہوا کا ذائقہ چکھتے چکھاتے اس شہر ستمگر کو پہنچے جو شہر ہرات کے نام سے معروف ہے۔ "وہ جہاں کے بچہ سے لیکر بوڑھے تک کے پیہم سوالات۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہاں سے آئے ہو، کیوں آئے ہو، کس راستے آئے ہو" نے بے زار و پریشان کیا۔ یہ شہر وہی شہر ہے جو ۹۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک تیموری شہزادوں کی آپسی خانہ جنگی کا دنگل بنا اور پامال و ذلیل ہوا اور خود آزاد کو "کافر بننے کا بھی اتفاق ہوا"

آزاد کا یہ سفرنامہ علمی اعتبار سے کافی کامیاب تھا۔ مختلف علماء و مشائخ سے مذاکرے اور بحثیں استفادہ کا باعث بنیں۔

سخندانِ فارس :

سخندانِ فارس میں لسانی بحث ملتی ہے اور اسی مباحثانہ پہلو کے ساتھ ایران، ہندوستان کے قدیم رسم و رواج کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور اپنے تاثرات و تجربات کی نقش آرائی میں تخلیقی توازن کو قائم رکھا ہے۔ یہ کتاب بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصۂ اول علم اللسان کی بحث پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے لغات اور تخلیق سے متعلقہ اصولوں کو منضبط کیا ہے۔ خصوصاً انہوں نے سنسکرت اور فارسی کے باہمی رشتے پر عمدہ عالمانہ بحث کی ہے اور اپنی گہری سوچ و فکر کے مثبت نتائج مرتب کئے ہیں۔ اور حصۂ دوم میں گیارہ تقریروں کے ذریعہ فارسی کی تاریخ، ایران و اصفہان کی تعریف، فارس کی قدیم زبان، فارسی زبان، فتح ایران کے بعد فارس کی مروجہ زبان، قدما کے رسوم و اصول، فتح ایران کے بعد اہل ایران، موسم بہار، ایرانی زندگی میں اسلامی اخوت کا دخل، عربی و فارسی کا مطالعہ، ہندوستانی فارسی اور نظم فارسی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ان تقریروں کی زبان وہی تخلیقی زبان ہے جو آبِ حیات یا دربارِ اکبری میں استعمال کی گئی ہے۔ اظہار و بیان کی یہ دقیع قوت لفظوں کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے اور من چاہا نقشہ بناتی ہے بظاہر یہ زبان یا منجمد نقشے کو بھی نوع سے مرئی اشیا سے کمزور نہیں۔ یہ کتاب،

لسانی، تاریخی، اور ثقافتی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ احاطہ خاصا کامیاب ہے کیوں کہ اس کے قبل اس موضوع پر کوئی تحریر ادبی صفحات پر نظر نہیں آتی۔ یہ تو آزاد کی ذہنی فراخی اور وسعت نظر تھی جس نے اُن چھوٹے موضوع کو چھوا اور اپنی علمی چھوان سے سونا بنا دیا۔ لفظ اور اس کی علمی سطح پر آزاد کی بحث کافی مفید اور کارآمد ہے۔

دیوانِ ذوق: دیوانِ ذوق کی ترتیب میں آزاد نے قلمی مسودوں، بیاضوں اور یادداشتوں سے مدد لی ہے۔ ابتدائی حصہ سوانح عمری پر مشتمل ہے۔ اشعار، غزل اور اور بعض قصیدوں پر ان کے تشریحی نوٹ نہ صرف دلچسپ بلکہ مفید اور کارآمد ہیں۔ ۱۰ ماہ کی اس طویل محنت نے ان سے گمشدہ یا بے ترتیب اوراق کی بازیافت کرائی جو آج مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ جس کے متعلق آزاد کا بیان ہے کہ " میں نے اس دیوان کو ترتیب دینے میں بڑی محنت کی ہے۔ ۱۰ ماہ تک دن رات آنکھوں کا تیل ٹپکایا ہے۔ الزام یہ ہے کہ میں خود غزلیں کہہ کر استاد کے نام سے شائع کرتا ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو خود اپنے نام سے شائع کرتا۔"

یہ وہ دیوان ہے جس کو انہوں نے ایران سے واپسی کے بعد ۱۸۸۸ء میں مرتب کیا۔ اور اس سلسلے میں ان کا یہ بیان قابل غور ہے کہ "ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صد ہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس لکھے ہیں۔

یہ دیوان مروجہ (مرتبہ حافظ ایران) میں کچھ چھپے اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے، پھٹے پرانے مسودے، لڑکپن سے بڑھاپے کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت سی تحریر ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر وغائب لکھتا اور جمع کرتا تھا، کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا مٹے حرفوں کا اجالنا، اس زمانے کے خیالات کو سمیٹنا، حالتوں کا تصور باندھنا بھولے ہوئے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر خدا اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہوگئیں اور دن اندھیرے ہوگئے جب یہ مہم سرانجام ہوئی ہے۔"

یہی وہ سخت محنت ہے جس نے آزاد کو جنون زدہ کیا اور انھیں اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ "آزاد کی دیوانگی کا راز اسی دیوان ذوق کی ترتیب میں مضمر ہے۔"

ڈرامہ اکبر : آزاد اس ڈرامہ کو حسب خواہش مکمل نہیں کر سکے۔ تھوڑا حصہ تیار ہوا تھا کہ دیوانگی نے قلم چھین لیا۔ اور ان کی وفات کے بعد اسے ناصر نذیر فراق نے مکمل کیا مگر "آزاد اپنی طرز میں آزاد نہ ہو سکے۔ ہاں اتنا ضرور کیا کہ ایک ادھوری چیز کو جو شاید نامکمل ہونے کی وجہ سے زمانہ کی دست برد سے بچ نہ سکتی تھی ایک حد تک محفوظ کر دیا۔"

(سید بادشاہ حسین اردو میں ڈرامہ نگاری ص ۱۸۱)

لیکن آزاد کے پوتے آغا محمد طاہر نے ڈرامہ اکبر کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ آزاد نے ہی اس ڈرامہ کو مکمل کیا۔ جس کا ایک حصہ ۱۹۰۷ء میں شیخ عبدالقادر نے مخزن میں شائع کر دیا تھا۔ فنی نقطۂ نظر سے بھی ڈرامہ مکمل اور عمدہ ہے۔ صاف اجلی زبان اور بیانیہ اسلوب نے ڈرامہ کے واقعات اور کرداروں کے درمیان تناسبات کو قائم و برقرار رکھا ہے۔

برہان قاطع : فارسی لغت جسے نول کشور پریس نے شائع کیا۔ یہ قیمتی لغت ر وی محمد حسین برہان کی بہترین کاوش ہے۔ جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ گفتار اول تا گفتار بست و نہم میں منقسم ہے۔

ماثرالامرا : شاہ نواز خاں صمصام الدولہ کی تصنیف ہے۔ جس کا نسبی نام عبدالرزاق تھا۔ ۲۹ رمضان ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۶۹۹ء میں بمقام لاہور پیدا ہوا لیکن ذہنی وجسمانی نشوونما اورنگ آباد دکن میں ہوئی۔ کتاب کی تکمیل اور اشاعت میر غلام علی آزاد نے کی۔ مصنف کے بیٹے میر عبدالخالق خاں نے جو بعد کو صمصام الدولہ صمصاد جنگ کے لقب سے مشہور ہوا۔ ۱۷۷۹ء میں اس کتاب کی نظر ثانی کر کے اس کو موجودہ صورت میں ترتیب دیا۔ میر عبدالحیٔ خاں صمصام جنگ کا انتقال ۲۸ اپریل ۱۷۸۲ء مطابق ۱۵ جمادی الاول

۱۱۹۶ھ کو ہوا۔

ماثر الامرا کا خاندان سادات خراسان سے اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آیا۔ مصنف کے پردادا امیر کمال الدین دربار اکبری سے وابستہ ہوئے اس خاندان کے افراد محمد شاہ جہانی اور عالمگیر جاہ و مرتبہ کے مالک تھے۔ دادا کا نام نواب قاسم خاں تھا جو ملتان کا دیوان تھا اور اس کے والد سید حسن علی خاں کو دکن کی صوبیداری تفویض ہوئی تھی۔

بابر: بن عمر شیخ مرزا ولد سلطان ابوسعید مرزا سر سلطان محمد مرزا فرزند سلطان میراں شاہ خلف امیر تیمور۔ پورا نام ظہیر الدین بابر تھا۔ بادشاہان دہلی کا مورث اعلیٰ۔ ننہال کی طرف سے اس کا سلسلہ چنگیز خاں سے ملتا ہے۔ ۶ محرم ۸۸۸ھ مطابق ۱۴۸۳ء کو پیدا ہوا ۱۴۹۴ء کو باپ کے انتقال کے بعد فرغانہ کی حکومت میسر آئی۔ موروثی حکومت کو مستحکم رکھنے کے لیے کئی جنگیں لڑنی پڑیں۔ کابل و قندھار کو احاطۂ حکومت میں لانے میں کامیاب ہوا۔ کابل اور اطراف کابل پر ۲۲ سالہ حکومت کے بعد ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ۱۵۲۶ء میں محمد ابراہیم لودھی کو شکست دے کر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ چار بار کے حملوں کے بعد پنجاب پر اپنا تسلط قائم کر سکا۔ وہ اہل سیف بھی تھا اور اہل قلم بھی۔ اس نے اپنی سوانح حیات "تزک بابری" ترکی زبان میں لکھی جس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ شاعر بھی تھا اور عمدہ نثار بھی۔

۹۳۱ھ مطابق ۱۵۳۰ء بعمر ۴۸ سال آگرہ میں وفات پائی اور وہیں نوشن باغ میں (جس کا ایک نام آرام باغ بھی ہے) میں مدفون ہوا۔ لیکن چھ ماہ بعد اس کی لاش کابل لے جا کر دفن کیا گیا۔ عہد شاہ جہانی میں روضہ کی تعمیر عمل میں آئی۔

ہمایوں : بابر کا سب سے بڑا اور عزیز بیٹا۔ بھائی کامران مرزا۔ کابل اور کندھار کا حاکم۔ بابر کی وفات کے بعد جب ۱۵۳۰ء مطابق ۹۳۷ھ میں ہمایوں تخت نشین ہوا تو کامران مرزا کی حاکمیت بڑھ کر پنجاب تک بڑھ گئی۔ چھوٹے بھائیوں ہندال مرزا اور عسکری مرزا کو سنبھل اور الول کے علاقہ کی سربراہی سونپی۔ ان بھائیوں نے ہمایوں کے خلاف پٹھانوں سے مل کر سازش تیار کی اور شیر خاں نے ہمایوں کو مغلوب کر کے خود شیر شاہ لقب اختیار کر کے بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ہمایوں کو دشت نوردی ملی۔ بھائیوں نے چشم پوشی کی۔ ایران کا سفر کیا۔ طہماسپ شاہ ایران نے خوش آمدید کہا۔ اور زخموں پر حسنِ سلوک کا مرہم رکھا۔ ۱۵ برس تک ایران میں اقامت اختیار کی۔ اسی اثناء میں شیر شاہ نے وفات پائی۔ اس کے جانشین نااہل ثابت ہوئے۔ ہمایوں پست ہمت نہ ہوا تھا۔ موقع ملا۔ کابل مطیع ہوا۔ بھائی کو شکست دی۔ قندھار فتح ہوا۔ ۱۵۵۵ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ پنجاب پر تسلط قائم کرتے ہوئے سکندر شاہ کو جو اس وقت دلّی کا بادشاہ تھا سرہند کے مقام پر شکست دی۔

اور فاتح کی حیثیت سے حدود دہلی میں داخل ہوا۔ یہ کامیابی بیرم خاں کی حکمت عملی سے میسّر آئی تھی۔ بیرم خاں کو خان خاناں کا خطاب دیا۔ ۱۱ر ربیع الاوّل ۹۶۳ھ مطابق ۲۵ر جنوری ۱۹۵۶ء کو کتب خانۂ دہلی کی چھت سے گر کر موت ملی۔

"ہمایوں بادشاہ از بام افتاد"

مادۂ تاریخ ہے۔ اکبر نے عالی شان سنگ مرمر کا مقبرہ تعمیر کرایا ہمایوں کا مقبرہ اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور ہے۔ دیگر شہزادگان اور شاہانِ مغلیہ بھی اسی مقبرہ میں دفن ہیں۔

گلبدن بیگم: بابر کی بیٹی ہمایوں کی بہن اور اکبر کی پھوپھی۔ شہزادہ خضر خاں کاشغری سے منسوب تھی۔ ۱۵۵۵ء مطابق ۹۶۲ھ میں خضر خاں لاہور کا ناظم مقرر ہوا اور بعد کو بہار کی نظامت ملی۔ وہیں ۱۵۵۹ء مطابق ۹۶۶ھ وفات پائی۔

سلیمہ سلطان بیگم: گل رخ بیگم کی لڑکی بابر کی نواسی تھی۔ مرزا انورالدین والد، شادی ۱۵۵۸ء کو بیرم خاں خان خاناں کے ساتھ بہ مقام جالندھر ہوئی۔ ۱۵۶۱ء میں بیرم خاں کی وفات کے بعد اکبر کی زوجیت میں آئی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکی شہزادی خانم اور ایک لڑکا سلطان مراد پیدا ہوا۔ زمانۂ جہانگیر ۱۶۱۲ء مطابق ۱۰۲۱ھ میں وفات پائی۔ ادب و شعر سے بھی دلچسپی تھی۔

اکبر: ابوالفتح جلال الدین محمد۔ ہمایوں کا بڑا بیٹا تھا۔ امر کوٹ (سندھ) میں اتوار کے دن ۱۵ر اکتوبر ۱۵۴۲ء مطابق ۹۴۹ھ کو پیدا ہوا۔ ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر کلانور میں تھا۔ بیرم خاں اور دیگر سرداروں کی موجودگی میں جمعہ کے دن ۱۴ر فروری ۱۵۵۶ء مطابق ۲ر ربیع الثانی ۹۶۳ھ کو صرف ۱۳ سال ۹ ماہ کی عمر میں بادشاہ تسلیم کیا گیا۔ اس نے اپنی سلطنت گجرات، بنگال، کشمیر اور سندھ تک وسعت دی۔ اٹک، آگرہ اور الہ آباد میں قلعوں کے علاوہ دیگر قومی عمارتیں بنوائیں۔ فتح پور سیکری نیا شہر آباد کیا۔ ۵۱ برس ۹ ماہ کی حکمرانی کے بعد ۶۴ برس ۱۱ ماہ کی عمر میں ۱۶ر اکتوبر ۱۶۰۵ء مطابق ۱۳ر جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ بدھ کے دن وفات پائی۔ سکندرہ نواح آگرہ میں دفن ہوا۔ جہانگیر نے مقبرہ بنوایا۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اس زمانے کی تفصیلی تاریخ لکھی ہے۔ اس نے راجہ مال دیو، راجہ بھگوان داس، راجہ مان سنگھ اور راجہ ٹوڈرمل کو اہم عہدہ پر فائز کیا۔ اپنی اور اپنے لڑکے کی شادی ہندو راجاؤں کی لڑکیوں سے کیں۔ بندوبست مال گزاری کا طریقہ جاری کیا۔ میر محلہ یعنی لکھپا کے عہدے بنائے۔ جزیہ ختم کیا۔ بحری طاقت میں بھی اضافہ کی غرض سے دو جہاز ۱۰۰۲ھ میں اور ۱۰۰۴ھ میں تیار کرائے۔ جو ۱۵ ہزار من بوجھ لے جا سکتے تھے۔ اور جس کی تعمیر پر سولہ ہزار تین سو ساڑھے تیس روپیہ کی لاگت آئی تھی۔ ہاتھی سے شکار کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ آتشی گولوں کی ایجاد ہوئی۔

۹۸۸ھ میں مردم شماری کرائی ہے علم دوست تھا۔ سنگھاسن بتیسی حیات الحیوان، اتھروید، تزک بابری۔ راماین۔ مہابھارت، نل دمن، اکبرنامہ وغیرہ یادگار ہیں۔ تعمیرات میں الہ آباد کا قلعہ، مسجد و خانقاہ شیخ سلیم چشتی، بنگالی محل۔ قلعہ اکبر آباد، ہمایوں کا مقبرہ، عبادت خانہ، چار ایوان، قلعہ تارا گڑھ مشہور ہیں۔ تخت نشینی کے ۲۰ سال تک اسلامی طور و طریقہ پر کاربند رہا۔ اجمیر شریف کی زیارت کی ۹۸۲ھ سے طور طریقہ بدلا۔ مذہبی مباحثہ کا دور شروع ہوا اجتہاد کا دعویٰ کیا۔ دین الٰہی ایجاد کیا۔

اورنگ زیب : نام محی الدین محمد اورنگ زیب کنیت ابوالمظفر المعروف بہ بادشاہ غازی تخت نشینی کے بعد عالمگیر کا لقب اختیار کیا۔ شاہ جہاں کا تیسرا بیٹا۔ تاریخ پیدائش میں مورخین کا اختلاف ہے۔ صحیح تاریخ پیدائش ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۸ھ مطابق ۱۶۱۹ء۔ یکم ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ مطابق ۱۶۵۷ء کو تخت نشین ہوا۔ کابل کی فتح کے بعد ۴ رمضان المبارک ۱۰۷۹ھ مطابق ۱۶۶۸ء کو تاج پوشی کی رسم انتہائی تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی جس کا سلسلہ ۲ ماہ تک قائم رہا۔ شمسی مہینہ ختم کر کے ہجری کا طریقہ جاری کیا۔ اسی طرح جشن نوروز ختم کر کے جشن عید الفطر قائم کیا۔ قومی مسجد کی تعمیر عمل میں آئی۔ شیواجی سے صلح ہوئی۔ سلطنت بے حد وسیع ہو گئی۔ کشمیر و تبت وغیرہ بھی سلطنت مغلیہ کا حصہ بن گئے۔ آمدنی سالانہ چالیس کروڑ تک پہنچ گئی۔ فتاوائے عالمگیری

شیخ نظام کی نگرانی میں تیار کرائی گئی۔ جس کا صرفہ ۹ لاکھ روپیہ تھا۔ حنفی طریقہ اور مسائل کی اصلاح کی گئی۔ بادشاہ خود بھی حدیث و فقہ کا عالم تھا۔ ترکی اور ہندی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ وہ ہندوستان دشمن نہیں بہت وسیع النظر بادشاہ تھا اس نے شرعی ضابطے بنائے۔ رقص و سرود کی محفلیں موقوف ہوئیں۔ ۹۱ سال ۱۲ یوم کی عمر میں بہ مقام احمد نگر پچاس سال دو ماہ حکومت کر کے بتاریخ ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۷۰۷ء جمعہ کے دن انتقال کیا۔

اورنگ آباد کے قریب بہ مقام خلد آباد شیخ زین الدین کے متصل مدفون ہوا۔ اس کی شادی شہنواز خاں پسر آصف خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی جس کے بطن سے ۵ لڑکے اور ۴ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ بڑا لڑکا سلطان محمد عالمگیر کی حیات میں ہی انتقال کر گیا۔ دوسرا لڑکا محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے جانشین ہوا۔ تیسرا لڑکا اعظم شاہ اپنے بھائی سے جنگ کرتے ہوئے مارا گیا۔ چوتھا لڑکا محمد اکبر باپ سے ناراض ہو کر فارس چلا گیا اور وہیں وفات پائی۔ پانچواں بیٹا کام بخش بھی ایک جنگ میں مارا گیا۔ زیب النساء۔ زینت النساء۔ بدر النساء اور مہر النساء لڑکیاں ہیں۔

زیب النساء بیگم: اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی۔ ۵ فروری ۱۶۳۹ء مطابق ۱۰ شوال ۱۰۴۸ھ کو دلرس بانو بنت شاہ نواز خاں صفوی کے بطن سے پیدا ہوئی۔ شاہ نواز خاں کے باپ کا نام مرزا رستم قندھاری تھا۔ عالمگیر نے اس کو احمد آباد اور گجرات کی صوبہ داری عطا کی

لیکن اپنے دلماد کے خلاف داراشکوہ کا ساتھ دیا۔ اطراف اجمیر جنگ میں دلیر خاں کے نیزے نے شاہ نواز خاں حریف عالمگیر کا کام تمام کر دیا۔ اسی کی نواسی زیب النساءٔ فارسی اور عربی میں کامل استعداد رکھتی تھی مخفیؔ تخلص تھا۔

عنایت اللہ خاں امرائے عہد عالمگیری میں سے تھا۔ جس کی والدہ حافظ مریم نے زیب النساء کی تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی لی۔ رسم زمانہ کے مطابق مخفیؔ نے قرآن حفظ کیا۔ اور عربی و فارسی میں دستگاہِ اعلیٰ حاصل کی۔ ملا سعید اشرف ژندرانی جس کی ہمہ دانی اور قابلیت سے مخفیؔ نے فائدہ اٹھایا۔ شاعری میں انہیں بزرگ سے اصلاح لی۔ وطن کی یاد آئی۔ واپس جانا چاہا۔ اجازت نہیں ملی قصیدہ لکھ کر شہزادی کی خدمت میں بھجوایا۔ انعام و اکرام کے ساتھ وطن جانے کی اجازت دے دی گئی۔

زیب النساء ایک آزاد ذہن اور حساس خاتون تھیں انہیں سیاسی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر حاسدین کے ورغلانے سے بادشاہ کو زیب النساء کی طرف سے بدظن کر دیا۔" جس کی وجہ سے چند روز کے لیے اس کی تنخواہ چار لاکھ سالانہ بند کر دی گئی۔ اور تمام مال و متاع ضبط کر لیا گیا۔ اس کے بعد تحقیقات ہوتی رہی۔ جس میں وہ بے گناہ ثابت ہوئی۔ تمام اعزاز و اکرام بحال اور اس کا ضبط شدہ مال و اسباب واپس دے دیا گیا۔"

(مقدمہ دیوان مخفیؔ ص ۲)

اورنگ زیب جب دکن کی جنگی مہم پر تھا۔ ۱۷۰۱ء مطابق ۱۱۱۳ھ کو

۶۲ سال کی عمر میں بمقام دہلی انتقال کیا۔ مجرد زندگی گزاری تھی۔ مقبرہ کابلی دروازہ دہلی میں واقع ہے زیب التفاسیر اور دیوان مخفی یادگار ہیں۔

چاند بی بی: چاند سلطانہ دکن کی مشہور خاتون، حسین نظام شاہ والیٔ احمد نگر کی بیٹی، مرتضیٰ نظام شاہ کی بہن اور بیجاپور کے علی عادل شاہ کی بیگم تھی۔ ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا نابالغ بھتیجہ ابراہیم عادل شاہ دوم (۱۵۷۹ء تا ۱۶۲۸ء) مسند نشین ہوا۔ ادب دوست اور فن موسیقی کا ماہر۔ کتاب "نورس" فن موسیقی سے متعلق اس کی یادگار ہے۔" اس کی نابالغی کے زمانے میں چاند بی بی بہ حیثیت سرپرست کے بیجاپور کی سلطنت کا کام انجام دیتی رہی۔ مشہور مدبّر اور سیاست داں تھی۔ ۱۵۹۵ء میں مراد نے دکن پر لشکر کشی کی تھی۔ اس جاں باز خاتون نے احمد نگر کو مراد کے جبروت سے محفوظ رکھا۔ جرأت و بہادری کی تاریخ میں اپنا نام روشن کر دیا۔ چاند بی بی ایک تاریخ ساز شخصیت ہے۔ مراد مرزا اکبر کا دوسرا بیٹا سلیمہ بیگم کے بطن سے تھا۔ اکبر نے دکن کی مہم پر اسی کا انتخاب کیا تھا لیکن کثرتِ مے نوشی کی وجہ سے یکم مئی ۱۵۹۹ء مطابق ۱۵ رشوال ۱۰۰۷ھ میں بہ مقام شاپور (ایران) وفات پائی۔ اور وہیں سپرد خاک کیا گیا اور پھر بعد میں لاش دہلی لاکر مقبرۂ ہمایوں میں دوبارہ دفن کی گئی۔

۱۵۹۹ء مطابق ۱۰۰۸ھ میں اکبر نے دوسری بار احمد نگر پر لشکر کشی کا حکم دیا۔ حبشہ خاں خواجہ سرا کی سازش نے چاند بی بی کو قتل کرا دیا۔

حبشہ خاں جیسے صدہا اسلام دشمنوں نے مملکت اسلامیہ اور تعلیمات اسلامیہ کو نقصان پہنچایا صدق و راستی کے لیے درپے آزار رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔

مانی : فارسی شعر و ادب میں مانی و بہزاد دو مصوروں کا ذکر ملتا ہے۔ مانی ۲۷۰ء میں شاپور (ایران) میں پیدا ہوا وہ مصور ہی نہیں " ایک نئے مذہب کے بانی ہونے کا بھی ادعا کیا تھا" حضرت عیسیٰؑ کے بعد اس نے عوام کو یقین دلایا کہ جس نجات دہندہ کی خبر حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی وہ میں ہوں۔ اس کے مقلدین کی جب تعداد بڑھی تو بادشاہ ایران نے اس کی سرزنش کے لیے گرفتاری کا ارادہ کیا۔ خبر پاکر وہ چین کی طرف راہِ فرار اختیار کی اور ایک عرصۂ دراز تک بادشاہ کی نظروں سے روپوش رہا۔ اس کے مقلدین کو یقین تھا کہ مانی آسمان پر گیا ہے وقفہ کے بعد ظاہر ہوگا۔ اسی درمیان اس نے " نادر و نایاب تصویریں بنائیں اور اپنے مقلدین کو یقین دلایا کہ فن مصوری کے یہ اعلیٰ نمونے خدا کی طرف سے آئے ہیں۔"

یہ نادر تصویریں ایک کتاب میں مجلد محفوظ کی گئی تھیں جس کی ارژنگ (ارتنگ) یا نگارخانۂ مانی کہتے ہیں۔ ارژنگ نام کا ایک مصور ملک چین میں گزرا ہے جو مانی کا ہم عصر تھا۔ مانی کے مقلدین نے اس کے قول و احکام پر یقین کیا۔ اور ان تصویروں کو معجزہ مانتے ہوئے عبادت کے سجدے کیے۔ روایت ہے کہ شاپور ثانی جس کا " ذوالاکتاف" لقب تھا۔ ہرمز ثانی شاہ ایران کا لڑکا تھا۔

مانی سے متاثر ہوا اور اپنے بیمار بچّے کی صحت کے لیے اس کو طلب کیا لیکن وہ بیمار بچّہ مانی کی گود میں آتے ہی فوت ہو گیا۔ شاپور نے اس کی جھوٹی نبوّت کے جرم میں موت کی سزا دی۔ کچھ کہتے ہیں قتل کے بعد اس کی کھال کھنچوائی تھی۔

شاپور : شاپور کنّیت ہے۔ اس نام کا ایک شاعر بھی طہران میں تھا۔ ملک الشعراء خطاب تھا۔ ۱۶۳۸ء مطابق ۱۰۴۸ھ کو تبریز میں وفات پائی۔ اور بمقام سرخاب مزار واقع ہے

سلسلۂ شاپور ساسانی خاندان (ایران) سے متعلق ہے۔ اردشیر بابکان کا بیٹا تھا اور شاپور ثالث تک منتہا ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ شاپور اول ۲۴۰ء میں تخت نشین ہوا۔ رومن مملکت کو شکست دی۔ اور اڈیسا کی جنگ میں رومی شہنشاہ دلیرین کی زندہ کھال کھنچوالی تھی۔ ۲۷۳ھ میں فوت ہو گیا۔ جارجیا اور آرمنیا کو بھی فتح کیا۔ اس کے بیٹے ہرمز اول کو جانشین تسلیم کیا گیا۔ شاہ پور ثانی کے زمانۂ حاکمیت میں سلطنت بہت وسیع ہوئی۔ ۱۰۰ ۶۳۸ بعمر ۷۰ سال فوت ہوا۔ شاپور ثالث نے صرف پانچ سال حکومت کی۔ خیمہ گر جانے کے باعث دب کر ہلاک ہو گیا۔

ظہوری : (ملا ترشیزی) شہر ترشیز ضلع سبزوار ملک ایران کے رہنے والے تھے۔ ان کا اصل نام نورالدین تھا۔ زمانۂ ابراہیم عادل شاہ ثانی احمد نگر آئے۔ اور یہیں ہندوستان میں عمر گزار دی۔ ''ساقی نامہ'' لکھا۔ جس میں ۴ ہزار بیت ہیں جس کو برہان نظام شاہ ثانی

احمد نگری کے نام سے معنون کیا گیا۔ اسی خاندان سے برہان نظام شاہ اول تخت احمد نگر پر ۱۵۰۸ء مطابق ۹۱۴ھ کو سات کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا۔ ۴۷ سال حکومت کی۔ ۱۵۵۴ء مطابق ۹۶۱ھ میں انتقال کیا۔ برہان نظام شاہ ثانی برادر مرتضیٰ نظام ثانی ۱۵ ار مئی ۱۵۹۱ء مطابق یکم شعبان ۹۹۹ھ خود اپنے لڑکے اسمعیل نظام شاہ کو معزول اور قید کرنے کے بعد تخت نشین ہوا۔ باوجود ضعیف ہونے کے عیاشی کی طرف مائل ہوا۔ بادشاہ بیجاپور سے جنگ کی شکست کھائی۔ صرف ۴ سال ۱۶ یوم حکومت کرنے کے بعد ۱۸ ر اپریل ۱۵۹۵ء مطابق ۸ ر شعبان ۱۰۰۳ھ کو انتقال کیا۔

ظہوری ایک باکمال شاعر اور انشا پرداز تھا۔ "ساقی نامہ" کے علاوہ دیگر کتابوں میں مینا بازار، رقعات عالمگیری، سہ نثر۔ ایک دیوان، رسالہ نورس، خوان خلیل اور گلزار ابراہیم بہت مشہور ہیں۔ آخری تین کتابیں ابراہیم عادل شاہ کے نام ممنون کی گئی ہیں۔ ۹۰ برس سے زاید عمر پاکر ۱۶۱۷ء مطابق ۱۰۱۶ھ اپنے خسر ملک قمی کے ایک سال بعد انتقال کیا۔

قاسم مشہدی: قاسم ارسلان کے نام سے بھی معروف ہوئے وطن مشہد ہے۔ محمود غزنوی کے سپہ سالار ارسلان جاذب کی اولاد۔ زمانۂ اکبر بادشاہ اپنی علمیت اور شعر گوئی کے لئے مشہور ہیں۔ ۱۵۸۷ء مطابق ۹۹۵ھ میں انتقال کیا۔ خان زمان کی بغاوت فرد کرنے پر اس نے "مبارک فتح اکبر" مادۂ تاریخ لکھا۔
۹۷۴ھ

سید جمال الدین خاں افغانی : ۱۸۳۹ء میں بہ مقام بیت شرف (کابل) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۶ء میں ہندوستان آئے۔ ایک سال کچھ مہینے علوم مغربیہ میں دستگاہ حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء میں مکہ کا سفر کیا۔ ۱۸۷۹ء میں دوبارہ بہ راہ مصر ہندوستان آئے۔ اور حیدرآباد میں اقامت اختیار کی۔ مصر کے سیاسی حالات کے پیش نظر کلکتہ کا سفر کیا۔ ۱۸۹۰ء میں جب آپ ایران میں قیام پذیر تھے۔ شاہ ایران کے حکم سے گرفتار کئے گئے۔ اور ملک بدری کا حکم دیا گیا۔ قسطنطنیہ چلے گئے اور وہیں ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو وفات پائی۔

ملّا دو پیازہ : عبدالمومن نام، ولی محمد کا بیٹا۔ راجہ بیربل کا ہم عصر۔ فارسی کا شاعر۔ ابو الفضل کا شاگرد۔ آخری عمر میں ہنڈیا (الہ آباد) پہنچا۔ لوگوں سے بستی کا نام پوچھا کسی نے کہا ہنڈیا۔ سُن کر کہا "دو پیازہ اب ہنڈیا میں آکر کہاں جائے۔" آخر وہیں وفات پائی۔ اور وہیں دفن ہوا۔ "اتراک عالمگیری" ترکی زبان کا لغت مرتب کیا۔ اصل وطن متھرا تھا۔ دوہے بھی لاجواب کہے۔ اس کے اور بیربل کے لطائف مشہور ہیں۔

فیضی : شیخ ابوالفیض بن شیخ مبارک ۱۵۴۷ء میں پیدا ہوا۔ ابوالفضل کا چھوٹا بھائی۔ ملک الشعراغزالی مشہدی کے

انتقال کے بعد ۱۵۷۲ء میں ملک الشعراء کا اعزاز حاصل کیا۔ اور شہزادی کی اتالیقی کا کام بھی سپرد ہوا۔ تاریخ فلسفہ، طب اور انشاء پردازی میں مہارت کاملہ حاصل تھی سنسکرت زبان سے بھی بہ خوبی واقف تھا۔ مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا درس حاصل تھا۔ فارسی اور عربی زبان کا ماہر۔ فارسی کا بلند پایہ شاعر۔ ایک سو ایک کتابوں کا مصنف۔ خمسہ نظامی کے طرز پر پانچ کتابوں کا ایک مجموعہ مکمل کیا۔ جس میں مرکز الدوار، سلیمان و بلقیس، نل دمن، ہفت کشور اور اکبر نامہ شامل ہیں۔ نل دمن۔ گیتا اور لیلا وتی اور دوسری کئی سنسکرت کی تصانیف کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ قرآن پاک کی تفسیر بے نقط۔ موسومہ "سواطع الالہام" قیمتی یادگار ہے۔ ایک اور تفسیر بہ نام مورد الکلام ہے "انشائے فیضی" بھی شہرت رکھتی ہے۔ عارضۂ دمہ میں بہ عمر ۴۹ سال ۱۵۹۵ء مطابق ۱۰۰۴ھ میں جائے آگرہ انتقال کیا۔

راجہ مان سنگھ : راجہ امبر (جے پور) بھگوان داس کچھواہا کا بیٹا تھا۔ عہد اکبری کا ممتاز سردار اور دلیر سپہ سالار تھا۔ کابل اور بنگال کی صوبہ داری میسّر آئی تھی۔ راجہ کا خطاب اور ہفت ہزاری کا منصب ملا۔ ۱۶۱۴ء مطابق مقام برار فوت ہوا۔

سعادت علی خاں : نواب یمن الدولہ لقب ہے۔ آصف الدولہ کی وفات کے بعد

نواب وزیر خاں مسند اودھ کا مالک بنا لیکن سعادت علی خاں نے سر جان شور گورنر جنرل کی اعانت سے ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء مطابق ۴ شعبان ۱۲۱۲ھ میں مسند نشینی کا حق حاصل کیا۔ ۱۷ برس حکومت کی۔ ۱۱ جولائی ۱۸۱۴ء مطابق ۲۲ رجب ۱۲۹۲ھ کو انتقال کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا غازی الدین حیدر تخت نشین ہوا۔ سعادت علی خاں اور انگریز گورنر کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا۔ اس کی رو سے ۷۶ لاکھ سالانہ کی ادائیگی لازم ہوتی۔ دس ہزار انگریزی فوج اودھ میں رکھنا لازم ہوا۔ یہی نہیں قلعہ الہ آباد انگریزوں کو دینا پڑا اور "بارہ لاکھ روپیہ نقد بطور معاوضہ مسند نشینی انگریزوں کو دیا گیا۔"

ڈاکٹر لائٹنر: پہلے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل پھر ڈائرکٹر اور پھر یونیورسٹی کے رجسٹرار ہوئے۔ ۱۸۷۶ء کو سنٹرل ایشیا میں پولیٹیکل خدمات پر فائز ہوئے۔

سالار جنگ: سالار جنگ کا خطاب سب سے پہلے میر تراب علی خاں مختار الملک کو دیا گیا۔ پھر اُن کے بڑے بیٹے میر لائق علی خاں کو ملا اور پھر میر لائق علی خاں کے بیٹے نواب سید یوسف علی خاں کو یہ خطاب منتقل ہوا۔ یہ اصحاب سالار جنگ اول، دوم اور سوم سے معروف ہوئے۔ آزاد نے نواب

میر تراب علی خاں کی وفات پر رنج وغم کا اظہار کیا اور مدتوں آب دیدہ رہے۔ انہیں ہی حکومت برطانیہ نے سر کا خطاب دیا تھا۔ دادا میر تراب علی خاں ۲۴ر جمادی الثانی ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۹ء کو پیدا ہوئے تھے سلسلۂ نسب اویس قرنی سے ملتا ہے رسول خدا کے عاشق نادیدہ۔ صاحب معرفت بزرگ تھے۔ یمن کے قبیلۂ قرن سے تعلق تھا۔ میر تراب علی خاں کا خطاب شمس الامراء مختار الملک، نواب سالار جنگ تھا۔ انہیں عربی فارسی میں معقول دستگاہ حاصل تھی شمشیر بازی اور شہسواری میں طاق تھے ۱۹ سال کی عمر تلنگانہ کے ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے ۱۸۵۳ء میں وزیر اعظم کا عہدہ ملا۔ حیدر آباد میں علم وفنون کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سالار جنگ میوزیم، کتب خانہ یادگار ہے۔ مرض ہیضہ میں مبتلا ہو کر ۲۹ ربیع الاول مطابق ۸ر فروری ۱۸۸۳ء کو دن پنجشنبہ ۷½ بجے شب شام کو انتقال کیا اور بروز جمعہ ۱۰ بجے دن کو دائرہ میر مومن حیدر آباد دفن ہوئے۔ عزیز جنگ بہادر نے قطعۂ تاریخ وفات لکھا

راہی دار الجناں گردید زیں دیر خراب (۱۸۸۳ء)

صاحب ہمت وزیر باخبر سالار جنگ (۱۹۲۹ ابجد)

میر تراب علی خاں کے بیٹے میر لائق علی خاں ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ زمانہ میر محبوب علی خاں ۱۸۸۴ء کو قلمدان وزارت سپرد ہوا۔ مصر و روم کی سیر کی۔ زمانۂ قیام قسطنطنیہ ترکی زبان سیکھی۔ ۷ر ذیقعدہ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۹ء کو انتقال کیا۔ ۱۸۷۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی سی ال کی ڈگری لی علیگڈھ کالج کے خصوصی معاونین میں تھے۔ کالج کا

ڈائننگ ہال اور سالار منزل آپ کی فیاضی کی یادگار ہیں۔

میر یوسف علی خاں بن میر لائق علی خاں کی پیدائش ۲۴ر شوال مطابق ۱۴ر جون ۱۸۸۹ء کو ہوئی۔ مدرسۂ عالیہ سے تعلیمی سلسلہ کا آغاز ہوا۔ ۱۸۹۸ء کو سالار جنگ سوم کا خطاب ملا۔ ۱۹۹۱ء میں وزارت سپرد ہوئی۔ دو سال بعد استعفیٰ دے دیا۔ مسلم یونیورسٹی کو ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ دیا۔ سرسید سے دوستانہ مراسم تھے لیکن کچھ اختلافات کے باعث مراسمات کشیدہ ہوئے۔ اسی ضمن میں شجاع احمد زیبا نے لکھا ہے کہ

" سرسید کے ساتھ سالار جنگ کا اتحاد باہمی ایک مدت تک قائم رہا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سالار جنگ کو سرسید کی دوستی سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ جب استرداد برار کے سلسلے میں اقتدار اعلیٰ کی بحث چھیڑنے اور حیدر آباد کے نقطۂ نظر کی پر زور وکالت کرنے کے جرم میں حکومت ہند کا سر سالار سے اختلاف ہوا اور لارڈ ڈفرن کی حکومت نے مختلف طریقوں سے انہیں تنگ کرنا شروع کیا تو سر سالار جنگ کو سرسید کے زبردست اثر و رسوخ کو جو انہیں لارڈ ڈفرن کی حکومت میں حاصل تھا۔ اپنے حق میں استعمال کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی۔ سرسید مسلمانان ہند کے متفق علیہ رہنما کی حیثیت سے حکومت ہند کو ایک اسلامی ریاست کے مسئلے میں متاثر کرنے کی پوزیشن میں تھے اور ان حالات میں جبکہ ریاست کا مدار المہام ان کا محب مخلص اور قدر دان ہو اور ریاست میں ان کے نامزد کردہ اسلامیان ہند کے

اعلیٰ ترین دماغ برسر کار ہوں تو سرسید پر لازم آتا تھا کہ وہ حکومت ہند کی رائے بدلنے کی کوشش کرتے۔ یا کم سے کم ان غلط فہمیوں کے رفع کرانے میں جو سرسالار جنگ اور حکومت کے درمیان پیدا ہو گئی تھیں پیش قدمی کرتے لیکن سرسید اس ضمن میں کوئی قدم نہ اٹھا سکے جس سے سرسالار جنگ کی پریشانیوں میں کسی قسم کی کمی ہو جاتی۔"

(مولوی نذیر احمد اور علیگڑھ تحریک ص ۸۴-۸۳)

اس سلسلے میں پروفیسر شجاع احمد زیبا نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ان تمام نکات پر اس موقع پر بحث یا تذکرہ مناسب نہیں۔ ۱۸۷۷ء ۱۸۸۱ء کا درمیانی وقفہ سرسالار جنگ کی سیاسی مشکلات کا وقفہ رہا ہے۔

سید علی بلگرامی: ۱۸۵۱ء میں اپنے وطن بلگرام میں پیدا ہوئے والد زین الدین خاں۔ ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لے کر حیدرآباد میں کسی دوسرے معزز عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ جنہوں نے علیؔ کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ پندرہ برس تک علوم عربی و فارسی پر توجہ دی گئی۔ "ذہن اور حافظے کی یہ حالت تھی کہ خود ان کے استادوں کو حیرت ہوتی۔"

(سید اعجاز حسین تاریخ ادب اردو ص ۳۲۶)

بی اے میں انگریزی اور سنسکرت خصوصی مضامین تھے۔ انہیں سالار جنگ نے جو حیدرآباد میں وزیر مختار الملک تھے، اپنے عملۂ خاص میں شامل کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ کے سفر کا انتظام کیا۔ بی۔ اے پاس

کرنے کے بعد ۱۸۷۹ء میں تعلیم کی غرض سے انگلینڈ کا سفر کیا۔

"علمی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ جتنی زبانوں سے واقفیت انہوں نے حاصل کی تھی اتنی شاید ہی ہندوستان میں ایک آدمی جانتا ہو۔"

(سید اعجاز حسین۔ تاریخ ادب اردو ص ۳۲۷)

عربی۔ فارسی۔ اردو۔ انگریزی۔ جرمن۔ فرانسیسی۔ لاطینی۔ سنسکرت۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ تلنگی۔ گجراتی۔ ہندی۔ تمدن ہند اور تمدن عرب فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا جس کا مصنف موسیو تھیان تھا۔ ۳ مئی ۱۹۱۱ء کو انتقال کیا۔

عماد الملک سید حسین بلگرامی:

سی اس آئی شمالی ہند کے پہلے مسلمان جو ریاست حیدرآباد میں منصب اعلیٰ حاصل کیا۔ سید زین الدین خاں کے بڑے بیٹے تھے۔ ۱۸۴۴ء میں گیا (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۱ء میں میٹرک اور ۱۸۶۶ء میں بی اے کی سند لی۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۲ء سر سالار جنگ مدار المہام دولت آصفیہ کی دعوت پر حیدرآباد گئے۔ ۱۸۷۳ء میں سر سالار جنگ میر لائق علی خاں کے پرسنل اسسٹنٹ ہوئے اور انہیں کی معیت میں مصر و روم اور پیرس کی سیاحت کی اور آٹھ برس تک معتمد امور عامہ رہے۔ ۱۸۸۲ء کو نظام دکن کے پرائیویٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور علی یار خان بہادر مؤتمن جنگ کا خطاب ملا۔

ملکی خدمات کے صلہ میں عماد الدولہ اور پھر عماد الملک کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۸۸۹ء سے ۱۹۰۷ء تک صیغۂ تعلیمات حیدرآباد کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ علیگڑھ کالج کے ٹرسٹی اور وائسرے کی کونسل میں معزز رکنیت حاصل رہی۔ پھر انڈیا کونسل کی رکنیت ملی۔ متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ قرآن کریم کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی ادبیات میں بھی خاصہ دخل رہا ہے۔ موصوف کے افراد خاندان میں بڑی بڑی نامور ہستیاں گزری ہیں۔ حیدرآباد دکن کی سیاسی و معاشی اور تمدنی زندگی کو پروبال بخشنے میں بلگرامی خاندان کا اہم حصہ رہا ہے۔ ان کے بیٹے سر عقیل جنگ اور پوتے سید نقی بلگرامی کی ادبی و علمی اور ثقافتی خدمات قابل قدر اور باعث تقلید ہیں۔

سید حسن بلگرامی : بلگرام کے خاندانِ سادات کے معزز رکن۔ آئی۔ ایم۔ ایس کی میڈیکل ڈگری حاصل کی۔ فوجی ملازمت میں میجر کے عہدہ تک ترقی پائی۔ ۱۸۹۲ء میں پنشن لے لی۔ اور پھر عرصہ تک لندن میں قیام کیا۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کی قومی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ تعلیمی کانفرنسوں میں کی گئی تقریریں یادگاری درجہ رکھتی ہیں۔ آزاد کے بہت دوست اور رفیق و دم ساز تھے۔ ۳۰ مئی ۱۹۱۵ء کو شب میں شملہ میں انتقال کیا۔

منشی نول کشور: منشی نول کشور متھرا کے ریڑھا نامی گاؤں میں ۳ر جنوری ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بابو جمنا پرشاد بھارگوا موضع ساسنی ضلع علیگڑھ کے نامی رئیس تھے۔ ان کے پانچ بیٹوں میں ایک نول کشور سے بڑے اور باقی چھوٹے تھے۔ نول کے دادا منشی بال مکند برطانوی حکومت میں آگرہ کے مہتمم محافظ خانہ تھے۔ چھ سال کی عمر تک متھرا اور آگرہ میں طفلانہ زندگی گزاری پھر ساسنی میں ابتدائی تعلیم کا مرحلہ طے ہوا۔ ثانوی تعلیم کے لیے آگرہ کالج میں داخلہ لیا۔ اسی زمانۂ طالب علمی میں مضموں نگاری کے شوق نے ترقی کی۔ "مضامین" "سفیر" آگرہ میں شائع ہونے لگے۔

۱۷ سال کی عمر میں شہرت یافتہ ہو گئے۔ انگریزی، ہندی اور اُردو زبانوں میں مہارت کاملہ حاصل تھی۔ مطبع "کوہِ نور" لاہور میں ملازمت کی۔ مالک منشی ہرسکھ رائے بھٹناگر بلند شہری نے نول کی عزت افزائی کی۔ منشی ہرسکھ رائے کو ایک مقدمہ کے سلسلہ میں سزائے قید ملی تو نول کشور جی نے ہر ممکنہ طور پر انہیں بری کرانے اور "کوہِ نور" کی توسیع و اشاعت میں گہری دلچسپی لی۔ ۴ سال کی ملازمت کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شامل ہو کر لکھنؤ کو اپنا مستقر ٹھہرایا اور یہیں اپنا مطبع قائم کیا۔ آغا میر کی ڈیوڑھی سے "اودھ اخبار" جاری کیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد گولہ گنج منتقل ہو گئے۔ پھر محلہ رکاب گنج میں راجہ مان سنگھ کی کوٹھی میں

مناسب جگہ حاصل کر کے وہیں پریس مستقلاً قائم کر دیا۔ اور کتابوں کا اشاعتی سلسلہ شروع ہوا۔ ان کی علمی خدمات کا ذکر چند صفحوں پر ممکن نہیں اس علم دوست نے ۱۸ ر فروری ۱۸۹۴ء میں بہ عمر ۵۹ سال وفات پائی ایک معزز شہری کی حیثیت سے حکومت نے انہیں سرکاری اعزاز سے نوازا۔ سی۔آئی۔ای قیصر ہند کا خطاب ملا۔

سر عبدالقادر : ۱۸۹۴ء میں فورمن کرسچین کالج لاہور سے بی۔اے کیا اور پنجاب "آبزرور" کی ادارت کی ذمہ داری قبول کی۔ ۱۹۰۱ء میں لاہور سے اپنا رسالہ مخزن جاری کیا۔ جو اردو صحافت میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں بیرسٹری کے لیے انگلستان کا سفر کیا۔ اور مملکت اسلامیہ کی سیاحت کرتے ہوئے دلی واپس لوٹے۔ بیرسٹری کی اعلیٰ سند سے سرفراز ہوئے۔ دلی لاہور اور سیال کوٹ میں وکالت کی۔ ۱۹۲۱ء میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج کا عہدہ ملا۔ مختلف اوقات میں پنجاب لیجسلیٹیو کونسل کے رکن، ڈپٹی پریزیڈنٹ، وزیر تعلیم، وائس رائے کے ایگزیکیٹو کونسل کے رکن وزیر ہند کے مشیر۔ بیرون ممالک میں حکومت ہند کے نمائندے اور ایک بار پھر ہائی کورٹ کے جج اور بھاولپور کے چیف جسٹس ہوئے۔

سر کشن پرشاد : یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرساد شاد ۱۸ ر جمادی الثانی ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء کو

حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام راجہ ہری کرشن تھا۔ آبا و اجداد کا تعلق دہلی کے قدیم معزز خاندان سے تھا۔ ۱۹۰۲ء میں ان کو عہدۂ وزارت اور راجہ راجگان مہاراجہ بہادر کا خاندانی خطاب عطا ہوا۔ ۱۹۰۳ء میں کے۔سی۔آئی۔ای اور ۱۹۱۰ء میں جی۔سی۔آئی۔ای کے معزز خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ ۱۹۱۲ء میں عہدۂ وزارت سے دست بردار ہو گئے تھے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد پھر ان کو وزارت سپرد کر دی گئی۔ ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا۔ کثیر التصانیف تھے جن میں سفرنامہ۔ روزنامچہ گلبرگہ (۱۹۲۳ء) رباعیات شاد (۱۹۲۶ء) سیر پنجاب۔ سیر و سفر۔ بزم خیال۔ کلام شاد۔ مخزن القوالی۔ اقوال حضرت علی۔ تفریح شاد۔ اور بیاض شاد (۱۹۲۸ء) وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے چند کتابیں نظامی پریس بدایوں سے بھی طبع ہوئیں۔

ذوق : شیخ محمد ابراہیم بن شیخ محمد رمضان انصاری ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔

ان کے والد فوج میں سپاہی تھے شوقؔ تخلص تھا۔ ذوقؔ شاہ نصیر کے شاگرد۔ مومنؔ و غالبؔ کے ہم عصر۔ بہادر شاہ ظفر کے استاد خاقانیٔ ہند خطاب۔ شاگردوں میں داغؔ کو زیادہ شہرت ملی۔ ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء بروز چہارشنبہ انتقال کیا۔ ایک دیوان اور ایک مثنوی "جاں سوز" یادگار ہے۔

مرنے سے تین گھنٹے قبل یہ شعر کہا تھا۔

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

سوداؔ: محمد رفیع سوداؔ کے سنِ ولادت کے سلسلے میں تذکرہ نگاروں نے مختلف تاریخیں بیان کی ہیں لیکن ان کے دوست نقش علی (مصنف باغ معنی) کے بیان کو زیادہ معتبر مانتے ہوئے یہ کہنا انسب ہے کہ ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۱۲ء اور ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷۱۲ء کے درمیان دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار محمد شفیع بہ سلسلۂ تجارت بخارا سے براہ کابل ہندوستان آئے " کابلی دروازہ" دہلی میں رہائش اختیار کی۔ سوداؔ نے تاجرانہ گداگری کو چھوڑ کر فوج کی نوکری کو اوّلیت دی۔ بقول میرؔ " نوکر پیشہ" یعنی مصاحب ہو گئے۔

سلیمان قلی خاں داؤدؔ شاہ حاتمؔ اور ترغیب خاں آرزو سے مشورۂ سخن کیا۔ ۶۰ برس کی عمر میں دلّی سے فرخ آباد کا سفر اختیار کیا۔ دیوان مہربان خاں رندؔ شاگرد میر سوزؔ نے خاطر خواہ پذیرائی کی لیکن احمد خاں بنگش کی وفات کے بعد خود دیوان صاحب کی آبرو خطرے میں آئی تو سودا جیسے مستغنی الاحوال اور مبتی حرص و جاہ کے لیے دوسرے ٹھکانے کی تلاش واجب تھی چنانچہ ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد کو مراجعت کی اور نواب شجاع الدولہ کے دربار سے وابستگی کا شرف حاصل کیا۔ نواب آصف الدولہ نے فیض آباد سے

لکھنؤ آباد کیا۔ سودا کے سابقہ (۱۰۰ روپیہ) وظیفہ کی توثیق کی مگر اس میں کسی اور زاید رقم کے اضافہ کی تصدیق نہیں ہوتی۔ حالانکہ پیش تذکرہ نگاروں نے چھ ہزار سالانہ وظیفہ کی گردان کی ہے۔ مگر اسی زمانہ کے مصنف بھگوان داس ہندی نے اپنی تصنیف "سفینۂ ہندی" میں "۲۰۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ کی بات لکھی ہے کسی اضافے وضافے کا یا لمبی رقم کا ذکر نہیں کیا۔

سودا کی وفات ۴ رجب ۱۱۹۵ھ مطابق ۲۶ جون ۱۷۸۱ء کو ۷۰ برس کی عمر میں ہوئی۔ شاہ حاتم نے کہا۔

"افسوس ہمارا پہلوان سخن مرگیا۔"

سودا نے شاعری کی تمام صنفوں پر طبع آزمائی کی اور اپنی شعری صلاحیتوں کا بہت عمدہ مظاہرہ کیا۔ سید اصلح الدین خاں نے کلیات سودا کی ترتیب و تدوین میں کثیر رقم خرچ کی اور سودا کے کلام کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کردیا جس کے متعلق محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "اس کلیات میں اوّل قصاید اردو، بزرگان دین کی مدح میں اور اہل دول کی تعریف میں، اسی طرح چند قصائد فارسی، ۲۴ مثنویاں ہیں۔ بہت سی حکایتیں ہیں اور لطائف منظوم ہیں۔ ایک مختصر دیوان فارسی کا تمام و کمال۔ دیوان ریختہ جس میں بہت سی لاجواب غزلیں (لگ بھگ ۵ ہزار شعر) اور مطلع رباعیاں، مستزاد، قطعات، تاریخیں پہیلیاں، واسوخت، ترجیع بند، مخمس اور ہجویں سب کچھ کہا ہے۔

مرزا کی دیگر تصانیف میں تذکرۂ شعراء اردو۔ سبیل ہدایت

اورعبرۃ الغافلین قابل ذکر ہیں جن میں آخرالذکر کتاب مرزا فاخر مکین کا مسکت جواب ہے۔ سودا کے مدحیہ قصائد سے قطع نظر ان کے ہجویہ قصیدہ بہ قول آزاد " عفونت میں سنڈاس سے بدتر ہیں اور اردو شاعری کی پیشانی پر سیاہ داغ" لیکن سودا کا مقام ہجو سے نہیں علمی ذکاوت اور متخیلانہ تخلیقیت سے ہے۔

مرزا کے ان بڑے کاموں پر اور ان کی مخصوص غزلیہ تکنیک پر جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ ان میں سودا (شیخ چاند) افکار سودا (شارب ردولوی) مطالعہ سودا (محمد حسن) مرزا محمد رفیع سودا (خلیق انجم) کلیات سودا (ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی) وغیرہ کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

غالب : اسد اللہ خاں نام۔ مرزا نوشہ لقب اور نجم الدولہ و دبیر الملک نظام جنگ شاہی خطاب تھا۔ پہلے اسد اور بعد غالب تخلص اختیار کیا۔ آبا و اجداد کا پیشہ تیغ زنی اور سپہ گری تھا۔ والد عبداللہ بیگ آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ آئے۔ اور پھر حیدرآباد پہنچے وہاں عزت نہ پائی تو راجہ بختیاور سنگھ کی دعوت پر الورپہنچے اور وہیں فوج میں ملازمت کی۔ ۱۸۰۱ء میں راجہ صاحب کی طرف سے لڑتے ہوئے وفات پائی۔ باپ کی وفات کے بعد پانچ سالہ غالب کی ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے سرپرستی کی مگر چار سال بعد ہی مہربان چچا کی شفقت سے بھی محروم ہوگئے۔ جنرل لیک نے ۷سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ بہادر شاہ ظفر نے بھی ۵۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ اور خلعت فاخرہ سے نوازا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی نے انہیں بھی تمام مراعات

سے محروم کر دیا۔ بادل نخواستہ رام پور آئے۔ اور نواب رامپور کے ۱۰۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ پر قناعت کی۔ مگر دہلی کی خاک انہیں دہلی کھینچ لائی۔ جائداد کی واپسی کے سلسلے میں کئی بار کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ اور بہت ساری کوششوں کے بعد آخر میں فرنگی سرکار سے پنشن مقرر ہوئی۔ ۷۳ برس کی عمر میں ۳ رذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء بروز پیر ادب وشعر کا یہ درخشندہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

غالب کے کلام کی تقسیم تین ادوار پر کی گئی ہے۔ پہلا دور فارسیت کا۔ دوسرا دور اردو فارسی کے اشتراک کا۔ اور تیسرا آخری دور سچا غالبی مزاج کا ہے، جس کا مجموعی تاثر احساس کی بلاغت اور فکر کی متانت ہے "ادب وشعر میں انہیں وہ پایہ حاصل ہوا جو سلطنت و تاجداری میں افراسیاب، طغرل، سنجر الپ ارسلان اور ملک شاہ نے حاصل کیا۔"

(غلام رسول مہر غالب ص۲۲)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کا محاسن کلام غالب۔ انور سدید کا غالب کی اقلیم ڈاکٹر سہیل بخاری کا غالب کے سات رنگ۔ محمد اکرم کا غالب نامہ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا غالب اور آہنگ غالب۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کا غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ، ظ۔ انصاری کا غالب شناسی۔ ڈاکٹر گیان چند کا رموز غالب وغیرہ غالبیات کے ذخیرہ میں بہترین اضافہ ہیں۔

انیس : میر ببر علی، محلہ گلاب باڑی فیض آباد میں پیدا ہوئے ان کی سن پیدائش کے ضمن میں کئی سارے اختلافات ہیں عموماً ان کا سال پیدائش ۱۸۰۱ء کو مستند مانا جاتا ہے۔ وفات ۲۹ دسمبر ۱۸۷۴ء مطابق ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۲۱ھ کو ہوئی۔ اکم نے تاریخ وفات کہی۔

" سوئے ارم انیس امام انام رفت "

ابتدائی تعلیم حسب دستور گھر پر ہوئی۔ گھر سے باہر کے پہلے استاد مولوی میر نجف علی فیض آبادی تھے۔ لکھنؤ مستقل سکونت اختیار کی مرثیہ گوئی کو باعث عزت اور خیر و برکت سمجھا اور توشۂ آخرت جانا۔ اول اول ان کے مرثیوں کو نول کشور اور نظامی پریس بدایوں نے شائع کیا۔ تقریباً سے او پر سلام اور ۵۰۰ کے قریب رباعیاں کہیں ان کی شہرت و عزت مرثیہ گوئی سے ملی۔ نول کشور نے ان مرثیوں کی پہلی جلد نومبر ۱۸۷۶ء کو شائع کی پھر ۱۸۸۰ اور ۸۲ کے درمیان تین مزید جلدیں شائع ہوئیں۔ پانچویں جلد جعفری پریس نے شائع کی۔ "شجرۂ غم" ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ نظامی پریس بدایوں نے نظم طباطبائی کی مرتبہ مرثیہ کی ۳ جلدیں ایک ساتھ شائع کیں اور یہ سلسلہ جاری ہے اور آگے بھی جاری رہے گا۔

دبیر : مرزا سلامت علی ($\frac{۱۸۰۳}{۱۲۸}$) نام مرزا غلام حسین جدا علیٰ ملا ہاشم شیرازی شاہ شاہ عالم کے عہد میں دہلی آئے۔ سات سال کی عمر میں یہ ہمراہ والد لکھنؤ آئے۔

علمی استعداد فاضلانہ تھی۔ مرثیہ میں مظفر حسین ضمیرؔ لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ استاد کی ایما پر دبیرؔ تخلص اختیار کیا۔ ۱۵ سال کی عمر سے مرثیہ کہنے کا آغاز کیا۔ اسے بہ قول آزادؔ "بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا۔" آخری عمر میں آنکھوں کے علاج کے لیے واجد علی شاہ کی ایما پر کلکتہ گئے۔ مرشد آباد اور عظیم آباد ہوتے ہوئے لکھنؤ واپس آئے۔ اور لکھنؤ میں ہی ۱۸۷۵ء مطابق ۱۲۹۲ھ کو انتقال کیا۔

جلال : سید ضامن علی بن حکیم میر اصغر علی ۱۸۲۵ء میں محلہ بازار لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ نواب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد اہل کمال لکھنؤ سے یکے بعد دیگرے دیگر ریاستوں میں اقامت کا انتظام کیا جلالؔ نے بھی نواب یوسف علی خاں کے عہد میں والد بزرگوار کی رفاقت میں رام پور میں رہائش اختیار کی۔ لیکن نواب کلب علی خاں نے چشم پوشی کی۔ ۲۰ سال بعد رام پور سے لکھنؤ واپس آئے۔ کچھ دنوں ریاست مانگرول کاٹھیا واڑ کے نواب قاضی حسین میاں کے ہاں قیام کیا۔ عمر کے آخری حصہ میں بینائی کمزور ہوئی۔ شروع میں اپنا کلام امیر خاں ہلالؔ کو دکھلایا پھر میر اوسط علی رشکؔ کو، اور جب رشکؔ کربلائے معلیٰ چلے گئے تو نواب فتح الدولہ برقؔ سے اصلاح لی۔ لیکن جب برقؔ بھی نواب واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے تو پھر کسی اور کی شاگردی نہیں قبول کی۔ شعری و نثری تصانیف میں شاہد شوخ طبع، کرشمہ گاہ سخن،

مضمون ہائے دلکش (دیوان سوم)، نظم نگاریں (دیوان چہارم) منتخب القواعد سرمایۂ زبان اردو، گلشن فیض، تنقیح اللغات، افادۂ تاریخ، رسالۂ عروض و قوافی اور مفید الشعراء کے نام مشہور ہیں۔ ۱۹۱۹ء بعمرہ، سال وفات پائی۔

اسیر: سید مظفر علی خاں اسیر کا وطن امیٹھی (لکھنؤ) تھا۔ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کے استاد۔ مصحفی کے شاگرد۔ عمر کے آخری حصہ میں نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کی مصاحبت حاصل کی۔ چھ دیوان اردو۔ ایک دیوان فارسی۔ ایک مثنوی "درۃ التاج" اور ایک رسالۂ عروض یادگار چھوڑا۔ ۱۸۸۱ء مطابق ۱۲۹۲ھ بعمر ۸۸ سال رام پور میں انتقال کیا۔ دو لڑکے حکیم اور افضل کے نام سے مشہور ہوئے۔ تلازمات میں امیر مینائی اور احمد علی شوق قدوائی مشہور ہیں۔

قائم: شیخ محمد قیام الدین قائم چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ سودا کے شاگرد۔ وطن میں ہی ۱۷۹۴ء مطابق ۱۲۰۷ھ میں انتقال کیا۔ قائم زیادہ تر دہلی میں رہے سال پیدائش کا صحیح تعین نہیں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۷۲۲ اور ۱۷۳۶ء کے درمیان پیدا ہوئے۔ زمانۂ شاہ عالم دہلی گئے اور توپ خانہ کے داروغہ مقرر ہوئے۔ دہلی کی سیاسی ابتری نے انہیں بھی دربدری پر

مجبور کیا۔ ٹانڈا (رام پور) میں ایک امیر سرکار سے متوسّل ہوئے۔ تین ماہ ہی سکون سے گزرے تھے کہ عافیت روزگار نے رام پور اور لکھنؤ کی خاک چھنوائی۔ تصانیف میں دیوان، مثنوی عشق درویش، حیرت افزا اور رموز الصلوٰۃ، مخزن نکات (فارسی) کے نام قابل ذکر ہیں۔

ناصر نذیر فراق دہلوی: آزاد کے چہیتے شاگرد۔ انہوں نے آزاد کے ادھورے ڈرامے "اکبر" کو مکمل کیا جیسا کہ سید بادشاہ حسین کہتے ہیں۔

"۱۹۰۶ء میں شیخ عبد القادر نے ادھورا قصّہ مخزن میں میں شائع کیا تھا۔ مرتے دم تک آزاد اس کو مکمل نہ کر سکے اور مرنے کے بعد بھی یہ یوں ہی رہا۔ بالآخر آغا طاہر نبیرۂ آزاد نے ناصر نذیر فراق دہلوی سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کو مکمل کر دیں۔ اور حسب فرمائش فراق نے ڈرامہ مکمل کیا۔"

(اردو میں ڈرامہ نگاری ص۸۶-۸۷)

سید جالب دہلوی: میر بشارت علی نام۔ جالب تخلّص تھا ۱۸۷۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دو سوا دو برس کی عمر کو پہنچے تھے کہ والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری والد کے دوست اکبر شاہ ثانی کے پڑپوتے عالم مرزا مغل نے انہیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ ابتدائی تعلیم اینگلو عربک اسکول دہلی

یں ہوئی۔ مولانا حالی اور خواجہ تصدق حسین سے علمی فیض حاصل کیا۔ ۱۸۹۰ء
یں میٹرک کے بعد سنٹ اسٹیفن مشن کالج دہلی سے انٹر کا امتحان پاس کیا
کم عمری میں شعر گوئی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ پہلے میر مہدی مجروح اور پھر
داغ سے مشورۂ سخن کیا۔ میر نثار علی شہرت کی ایما پر نثر کی طرف توجہ
مبذول کی۔ حکیم اجمل خاں کے "اکمل الاخبار" سے منسلک ہوئے۔ اسی کے ساتھ
دوسرے اخبارات کے لیے بھی مضامین لکھے۔ اودھ اخبار کے مالک منشی نول
کشور کی خواہش پر دلی سے لکھنؤ آ گئے۔ منشی نول کشور کے انتقال کے
بعد ملازمت ترک کر دی۔ ہندوستان کے متعدد اخبارات سے قلمی رشتہ قائم
رہا۔ دکن گزٹ (بمبئی) وکیل (امرتسر) پیسہ اخبار (لاہور) شریف
بی بی (دہلی) ہمدرد (دہلی) ہمدم (لکھنؤ) کے نام قابل ذکر ہیں۔
۲۵ر جولائی ۱۹۳۰ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ منشی لچھمن
پرشاد صدر لکھنوی نے تاریخ وفات کہی۔

"سوئے فردوس رفت جالب افسوس"

۱۳۴۷ھ

قاآنی: ۱۹ویں صدی کا ایک ایسا باکمال فارسی شاعر جو
بہ قول مولانا حامد حسین قادری ۱۸۰۷ء میں بمقام
شیراز پیدا ہوا اور ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انتقال کے
وقت اس کی زبان پر یہی وہ فارسی شعر تھا جس کی شہرت دور دور تک پہنچی۔

شرمندہ از آنیم کہ در دار مکافات
اندر خور عفو تو نہ کردیم گناہی

اس کی کمسنی ہی میں والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ جس وقت وہ بقائے دوام کی دہلیز پر پہنچا، خراسان کا حاکم حسن علی مرزا تھا جس نے اس کی کمسنی کے باوجود اپنا مصاحب بنایا۔ فتح علی شاہ قاچار اور محمد شاہ کے دربار سے بھی قاآنی کی وابستگی رہی ہے۔ محمد شاہ کی معزولی کے بعد ناصر الدین شاہ کے دربار میں بھی قاآنی کو منصبی اعزاز حاصل ہوا اور اسے ملک الشعرا کا خطاب بھی ودیعت کیا گیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ " اس دور (قاچاری) نے ترقی کرتے کرتے قاآنی جیسا قادر الکلام شاعر پیدا کیا جس سے قدما کا دور دوبارہ واپس آگیا۔"

(شعر العجم صـ ۱۲ جلد پنجم)

رضا زادہ شفق نے بھی اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے صائب کے بعد ایران کا سب سے مقبول و معروف شاعر قرار دیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر قصیدہ گو ہے اگرچہ اس نے دوسرے اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ نثر میں "گلستان" کے طرز پر "پریشان" نام کی کتاب لکھی ہے وہ شاعری کے علاوہ منطق، علم عروض، ریاضی، حکمت اور دوسرے فنون پر بھی قدرت رکھتا ہے اس نے فرانسیسی زبان بھی سیکھی انہیں اوصاف علمیہ کے باعث محمد کاظم شیرازی نے اسے اپنے عہد کا فارابی اور بو علی سینا قرار دیا ہے۔

پسِ لفظ

محمد حسین آزاد بنیادی طور پر تخلیقی فن کار تھے۔ ان کے مزاج میں تخلیقی رنگ و آہنگ کی جو خوشبو اور جذب و کشش ملتی ہے وہ ان کی تحریروں میں بھی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ آزاد نے اپنی تحریروں کو جامع اور متوازن بنانے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کے تخلیقی مزاج نے نقد و تحقیق کے مشکل ترین راستے کو بھی سہل بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید ہو یا علمی تخلیق یا کوئی شخصی اور غیر مرئی تذکرہ' ہر مقام پر تخلیقیت کا حُسن موجود ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ان کے اسلوب کو شگفتہ' تازہ اور معتبر بناتی ہے۔ موسیقانہ، مصوّرانہ اور شاعرانہ رنگ آمیزی کے باعث وہ تحریر اور بھی زیادہ سحر انگیز ہو جاتی ہے۔ ان کی نثری تازگی شعری محاکات کی عمدہ مثال ہے۔ آزاد کی زبان و بیان میں نئے پن کی چمک دمک رجھانے کی حد تک ملتی ہے وہ جس کی مدد سے اپنی شخصیت اور ادبیت کا عکس پڑھنے والے پر ڈال لیتے ہیں یہ عکس اتنا پختہ ہوتا ہے کہ معاندانہ روش بھی اسے مٹا نہیں سکتی۔ آزاد کے اس اسلوبی عکس نے کتنے ادیبوں کو اپنا مقلّد بنایا اور ان میں تخلیقی توانائی پیدا کی تاکہ وہ خود ہی اپنے لئے کوئی

نیا راستہ بنا سکیں۔

آزاد کا ذہن تقلیدی نہیں تھا اور نہ وہ مقلدین کی کوئی ٹیم ہی تیار کرنا چاہتے تھے۔ کسی کا مقلد ہونا ایک سچے اور فطری فن کار کے لئے ضروری نہیں کیوں کہ وہ خود بھی اپنے قد و قامت یا اوقات سے آشنا ہوتا ہے۔ جھوٹی ملمع سازی اور ریاست ہے۔ اس فعل ناقصہ میں وہی ملوث ہوتے ہیں جو سچے فن کار نہیں ہوتے۔ زیادہ باتیں کرنا، کسی کو بولنے نہ دینا، اپنی ہی ہانکتے رہنا کمزور ادیبوں اور شاعروں کا شیوہ ہوتا ہے اور وہ اپنے مجلسی تاؤ بھاؤ سے دوسرں کو مرعوب کرنا اور اپنی لیاقت (جاہلانہ یا منافقانہ) ظاہر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ان کی یہ خواہش کسی سچے فن کار کو (جیسا کہ وہ چاہتے ہیں) ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ ہاں وقتی طور پر سچے فن کار پس پردہ ہو جاتے ہیں لیکن ایک سچا تخلیقی فن کار ہزار پردے کے باوجود اپنی نوری تخلیقیت سے اپنی تحریروں کو منور کر دیتا ہے۔ اور خود آنے والے دور کے لیے مشعل راہ بن جاتا ہے۔

آزاد بھی ایسے ہی ایک فن کار تھے۔ ان کے ادبی اور علمی کارناموں پر نظر ڈالنے سے ان کی جو شخصیت پہلے نمو پائی دکھائی دیتی ہے، وہ تعلیمی ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی یا علمی زندگی کا آغاز تعلیمی کاموں سے کیا تھا۔ ان کا یہ ابتدائی کام تدریسی نوعیت کا تھا۔ ابتدائی جماعتوں کے لیے اردو کا قاعدہ لکھا۔ کچھ ہندی قصوں کو "قصص ہند" کے نام سے شائع کرایا جس کی زبان سادہ اور سہل تھی۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی مشہور ابتدائی کتابوں

کی طرح اُردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب تیار کی تھی۔ پہلے ایسی کتابیں موجود نہ تھیں جو طلبہ کی درسی ضرورتوں کو پورا کر سکتیں یہ تو آزاد کی ذہانت تھی کہ طلبہ کے لائق ایسی آسان، سہل اور دلچسپ کتابیں مرتب کیں۔ اسی طرح فارسی سکھانے کے لیے پہلی اور دوسری کتاب مرتب کی "جامع القواعد" بھی ایسی ہی درسی ضرورت کو پورا کرنے والی کتاب ہے۔

"نگارستانِ فارس" (۱۹۲۱) "فلسفہ الٰہیات" (۱۹۲۲)۔ سپاک و نمک (۱۹۲۷) نظم آزاد (۱۸۹۹) بھی اسی تخلیقی ذہنیت کی نمائندہ تصانیف ہیں۔

اُن کے علاوہ نصیحت کا کرن پھول، لغتِ آزاد۔ بیاضِ آزاد۔ آموزگارِ پارسی۔ جانورستان۔ کاشناسِ عرب۔ تذکرۂ علما۔ قواعد اردو اور خم کدۂ آزاد کی بھی اپنی الگ تاریخی اہمیت ہے۔

تحریریں آزاد کی ہوں یا دوسرے علمائے عصر کی، ان سے اس ناتواں یا دیوانے نے کسبِ نور کیا ہے میری تحریروں میں جو بھی اور جیسی بھی روشنی موجود ہے وہ انہیں بزرگوں اور علمائے عصر کا فیض ہے مگر فکری یا ذہنی اعتبار سے جس سطح پر خود کو محسوس کرتا ہوں یا اپنی تلاش میں خود کو سرگرداں دیکھتا ہوں تو ندامت رلا دیتی ہے۔ خود کو احتسابِ عمل سے گذارتا ہوں سہارا انہیں بزرگوں کا ہے۔ ان کی دعاؤں کا ہے جو مجھے مایوس یا ہراساں نہیں ہونے دیتیں دگرنہ کچھ لوگ جن کی عقلیں پیٹ اور گھٹنوں میں رہا کرتی ہیں صادقانہ فیصلے نہیں کر پاتیں۔

اشاعتی سلسلہ کاروبار نہیں، میری عبادت ہے جو بھی سکت اور طاقت ہے، خدا کی عطا ہے۔ قدر و تہذیب سے رشتے کو باقی رکھنے کی سعی فرض ہے۔ وہ نوری شمعیں جو پہلے بہت پہلے جلائی گئی تھیں روشن و تابندہ رہیں۔ میں اور میری بساط کیا۔ بزرگ عالموں کی پاک تحریریں میری طاقت ہیں۔ جی تو چاہتا ہے سلسلۂ تحریر دراز کروں خصوصاً فیضی، قائم چاندپوری، علی بلگرامی، حسن بلگرامی، حسین بلگرامی، زیب النساء مخفی اور قاآنی کے فکر و تعمق اور عالمانہ درک و بصیرت سے خود کو وابستہ کروں۔ کاش یہ سعادت مل پاتی۔ بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ وقت اور صفحات کی محدودیت مانع ہے۔

اللہ وہ طاقت و توانائی دے کہ میں نقشِ تسلسل کو قائم رکھ سکوں۔ محسنِ علم و ادب ملا نظامی بدایونی کی قاموس المشاہیر کی ان دو جلدوں کے بعد اسی طور کی تیسری اور چوتھی جلد کا کام "جو عصرِ جدید تک کا احاطہ کر سکے" پورا کر سکوں۔ آپ سب نیکوکاروں کی دعاؤں کا طالب:

ساحل احمد

الہ آباد

۲۹ر دسمبر ۱۹۹۶ء